اقبال

کا

فلسفۂ حیات و شاعری

محمد سرور

اقبال

کا

فلسفۂ حیات و شاعری

قاضی محمد عدیل عباسی
(ایم اے۔ ایل ایل بی۔ علیگ)
(ایڈووکیٹ دہلی)

بک سروس دہلی

(جملہ حقوق بحق ناشر محفوظ)

مئی ۱۹۷۱ء

قیمت ۶/-

ناشر
بک سروس۔ ۵۱۰ مٹیا محل۔ دہلی ۶
(دیوبند پریس دہلی)

ترتیب

انتساب	۵	ساحل اور موج	۶۶
عرضِ حال	۷	موتی اور شبنم	۶۶
اقبال کا ادبی نصب العین	۳۰	مجموعوں کے نام	۶۷
ادبی نصب العین کا مفہوم	۳۲	خاتمہ کلام	۶۸
اقبال اور حافظ	۳۸	اقبال اور اسلام	۷۰
اقبال	۳۳	حیاتِ بعد الممات	۸۸
خودی	۳۵	اِدّعا	۹۵
خودی کا تجزیہ	۴۷	اسرارِ خودی کی کہانی	۱۰۰
حرم اور فرنگ	۵۰	اپنا تجزیہ	۱۰۱
مکتب	۵۵	کلامِ اقبال کی اندرونی شہادت	۱۰۳
پروانہ اور جگنو	۵۷	اسرارِ خودی	۱۰۴
بلبل اور شاہین	۶۰	رموزِ بے خودی	۱۰۹
گل دلالہ	۶۵	اقبال اور دانشورانِ عالم	۱۲۳

تسخیر فطرت یا علم و عشق ۱۳۹
آدم از بہشت ہیروں آمدہ می گوید ۱۳۸
عالم اسلامی اور سامنس سے بیخبری ۱۴۱
علم کے حدود اور تسخیر نفس ۱۴۷
اعمال صالحہ ۱۵۴
مقام نبوت ۱۶۸
اقبال کا نظریہ ۱۷۱
رسالت ۱۷۷
بشر ۱۸۱
نیابت الٰہی ۱۸۸
ملا جمال الدین اور اقبال ۱۹۱
خاتم النبیین ۱۹۴
خاتم اقوام کے خصائص کا بچوڑ ۲۰۱
عشق رسول ۲۰۳
اقبال کا تصور مدینہ ۲۱۵
اقبال کا مرد کامل ۲۱۹
انسانیت کی عظمت ۲۲۱
اقبال اور نیٹشے ۲۲۴
مرد کامل کے خصائص ۲۲۵
اجتماعی زندگی ۲۳۷
جماعت حقہ میں عورت کا درجہ ۲۴۴
مرد کامل اور مرد مومن ۲۴۵

لاہور کے اسکولوں اور کالجوں کے ۱۹۲۳ء کے ان مخلص اور پرجوش نوجوانوں کے جذبۂ طلب کے نام جو مل جل کر ادارہ اخبار زمیندار لاہور کے اراکین کو دفتر میں گھیرتے اور دلی تمناؤں سے اصرار کرتے تھے کہ اسرارِ خودی یا رموزِ بیخودی کا ایک سبق پڑھا دیں۔

عرضِ حال

آج جبکہ بزمِ اقبال سارے عالم میں آراستہ ہو چکی ہے اور دنیا کے ہر ملک کے دانش وروں، ادیبوں اور نقادوں نے کلامِ اقبال کی شرح کر کے بارگاہِ شاعرِ اعظم میں نذرانۂ عقیدت پیش کیا ہے۔ اور شاید جتنا اقبال پر لکھا گیا ہے کسی اور کے بارے میں اس کا ایک جزو بھی احاطۂ تحریر میں نہیں آیا ہے۔ پھر میرے لئے اس موضوع پر قلم اٹھانا مضحکہ خیز سا معلوم ہوگا۔ مجھے اپنے بارے میں کسی قسم کی غلط فہمی کبھی نہیں ہے۔ پھر بھی میں اس جماعتِ رندانہ کا مرتکب ہوا ہوں، اس سے میری غرض نہ ادیبوں کی صف میں شامل ہونا ہے، اور نہ میں کسی ندرتِ خیال کا مدعی ہوں۔ میں نے طالب علمی سے اقبال کی نظم، ابوالکلام کی نثر اور حسرت موہانی کے غزل کا بڑا معتقد رہا، اور بڑے ذوق و شوق سے ان تینوں کا مطالعہ کرتا تھا۔ اور ان سب نے میری زندگی پر بڑا گہرا اثر ڈالا ہے۔ اس نو عمری کے زمانے میں اکثر میرا جی چاہتا تھا کہ ان تینوں کی تصویریں اپنے کمرے میں آویزاں

کر کے اس پر امیر خسرو کے اس شعر کا کتبہ لگا دوں ؎

خلق می گوید کہ خسرو بت پرستی می کند
آرے آرے می کنم با خلق و عالم کار نیست

۱۹۲۰ء میں یونیورسٹی اسکول آف لا الٰہ آباد سے ترکِ موالات کرنے کے بعد مجھے مولانا حسرت موہانی کی خدمت میں کچھ عرصہ تک رہنے کا موقع ملا اور اس دوران میں میرا وہ خیال حقیقت بن کر سامنے آیا جو مولانا کے اعلیٰ کردار عظیم بلند خیالی فقر و درویشی بیباکی دین محمودی اور انسانی شرافت کے بارے میں نادیدہ میں نے قائم کیا تھا۔ وہاں سے میں مدینہ بجنور اور پھر زمیندار لاہور میں چلا گیا۔ روزنامہ زمیندار اس وقت اپنے عروج پر تھا اور اس کے مالک و ایڈیٹر مولانا ظفر علی خاں منٹگمری جیل میں محبوس تھے۔ جہاں ان سے اکثر ملاقاتیں ہوتیں۔ زمیندار اخبار میں میری حیثیت چیف ایڈیٹر کی قرار دی گئی۔ اور مولانا غلام رسول مہر جوائنٹ ایڈیٹر اگرچہ سرورق پر ایک نابینا حافظ محمد احمد صاحب کا نام شائع ہوتا تھا۔ ایڈیٹروں کی گرفتاریاں اس کثرت سے ہو رہی تھیں کہ اخبار کا چلانا دشوار ہو گیا تھا۔ ایک عرصے کے بعد میرا نام دیا گیا اور فی الفور سات مقدمے میرے اوپر حسب دفعہ ۱۲۴ الف (حکومت کے خلاف نفرت پھیلانا) قائم ہو گئے۔ ایک سال سزا ہوئی اور لاہور سنٹرل جیل میں قیام رہا۔ لیکن نابینا حافظ کی مدد سے تقریباً ۸ ماہ کا وقت فرصت کا مل گیا۔ مولانا غلام رسول مہر جو اب ایک عظیم مصنف اور ایک مستند صحافی ہیں اس وقت یونیورسٹی کے تازہ گریجویٹ تھے اور اقبال کے شیدائی

اس وقت لاہور میں اقبال کا طوطی بول رہا تھا - اور اقبال کی شاعری کی دھوم ادنیٰ اور اعلیٰ میں مچی ہوئی تھی - اقبال کو سمجھنے اور اقبال کے کلام کا مطالعہ کرنے کے لیے انجمنیں اور سوسائٹیاں قائم تھیں۔ اسکولوں اور کالجوں کے لڑکے جماعت بنا کر دفتر زمیندار میں بھی آئے تھے اور مجھ سے اور دیگر ممبران ایڈیٹوریل اسٹاف سے جن میں مرتضیٰ حسین نیکش بھی شامل تھے ۔ذوق و شوق سے التجا کرتے تھے کہ اسرار خودی یا رموز بیخودی کا ایک سبق پڑھا دیجئے ۔ ظاہر ہے کہ لاہور پہنچنے پر میری تمنا علامہ اقبال کی خدمت میں حاضری تھی ۔ میرے دل میں اس عظیم شاعر کے بارے میں عجیب عجیب تخیلات تھے لیکن جب پہلی بار حاضر ہوا تو کچھ سماں ہی اور تھا - ایک انتہائی سادہ سا انسان جو کسی طرح اپنے کو دوسروں پر ممیز و ممتاز کرنے کا خواستگار نہ تھا حقہ پیتا جا رہا تھا اور سامر یار علم بھرنے کے نے نئے بھرے مقطعوں میں اللہ بخشا اللہ بخشا پکارتا رہتا تھا۔ موضوع سخن بین الاقوامی اسلامی سیاست یا اسلامی مسائل احادیث اور ان کی شرح میں اپنا ضعف ہیچ بس طرح حاضری کی تعداد میں اضافہ ہوتا گیا۔ مندرجہ بالا باتوں کا تجربہ قوی تر ہوتا گیا۔ سب سے زیادہ جس چیز نے مجھ کو متاثر کیا اور گرویدہ کیا وہ اس شخص کا ضبط نفس اور بے تکلف منکسر المزاجی تھی۔ پتہ بھی نہ چلتا تھا کہ اعتماد فرما رہے ہیں ۔ خاکساری کے اظہار میں بھی بعض وقت غرور پنہاں ہوتا ہے۔ اقبال میں احساس برتری کا کہیں نام نہ تھا۔ اسکول کے طالب علم نیز بے تکرار بار کہ جوش کے ساتھ گرم بحثیں کرتے تھے۔ دوسری جانب سے ہر بات کا جواب سکون اور خاموشی

سے دیا جاتا تھا۔ کبھی یہ نہ کہا کہ یہ بین الاقوامی یا پیچیدہ مسائل ہیں تم لوگ ان کو سمجھ نہیں سکتے۔ بس ایسا معلوم ہوتا تھا کہ برابر والوں میں بات ہو رہی ہے۔ عرق النسا کے مریض تھے ایک دن میں سویرے کے وقت گیا تو دیکھا کہ ایک حجام سے تیل مالش رہے ہیں اور وہ پوچھ رہا ہے کہ میاں اب جو لڑائی ہوگی تو کس کس کے بیچ ہوگی اور اس کا کیا انجام ہوگا وہ اسے اسلامی بین الاقوامی سیاست سمجھا رہے ہیں۔ اور کہہ رہے ہیں کہ اب کے تمام دنیائے اسلام ایک طرف ہوگی۔ اور دنیا کی عظیم طاقتوں سے ٹکراؤ ہوگا وغیرہ وغیرہ۔ الغرض یہ بزم شبانہ جو روز منعقد ہوتی تھی اس کی فضا سراسر اسلامی تھی۔

اس کے موضوعات گفتگو اسلامی اس کے افکار اسلامی اس کی نوعیت بحث اسلامی، چنانچہ ان سب کی شرح میں اقبال کے اشعار اسلامی اور صرف اسلامی۔ اس وقت تک میں کلام اقبال کا تقریباً حافظ ہو چکا تھا اور روزانہ بلا ناغہ سو اشعار پڑھے بغیر نہ آتا تھا۔ اخبار زمیندار کی عظیم مشغولیت کے زمانے میں بھی جسے جہاد سمجھ کر ہم لوگ نکال رہے تھے میرا یہ مشغلہ بند نہیں ہوا۔ اس متواتر مطالعہ سے جو تاثر میرے دل پر قائم ہوا تھا اس پر ان مضمون کی حاضری نے مہر تصدیق ثبت کر دی۔ اور یہ گمان یقین واثق میں تبدیل ہو گیا کہ اقبال نے نظم و شعر میں تعلیمات اسلام کی شرح کی ہے۔ امتداد زمانہ کے ساتھ جس طرح اقبال کی اور منظوم جلدیں شائع ہوتی رہیں یہ یقین ترقی کرتا گیا۔ چنانچہ اقبال کی عظمت میں جہاں مجھے کوئی کسر نظر آتی تھی۔ میرا پیمانۂ صبر لبریز ہو جاتا تھا اور قوت برداشت

جواب دیدیتی تھی۔ جیل سے رہائی اور ۱۹۲۵ء میں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں ایم۔ اے اور لا کا داخلہ لینے سے قبل میں مولانا محمد علی اور مولانا شوکت علی سے فرنگی محل لکھنؤ میں حضرت مولانا عبدالباری رحمۃ اللہ علیہ کے قیام گاہ پر ملا۔ میرے ہاتھ میں "پیام مشرق" یا کسی اور مجموعہ کا ایک نسخہ تھا۔ مولانا محمد علی نے دریافت کیا کہ کون سی کتاب ہے میں نے کتاب دکھائی انھوں نے ادھر ادھر ورق الٹے اور کہا کہ کب شائع ہوئی! مجھے سخت حیرت ہوئی اور اسی کے ساتھ ناگوار بھی ہوا کہ ہندوستان کا یہ مشہور دانشور اور اقبال کی تصنیف سے ناواقف ہے۔ مولانا محمد علی نے پھر اسی طرح ورق الٹ کر کتاب دو ایک منٹ میں واپس کر دی تھی کہ گویا اس میں کوئی چیز جاذب نظر ہے ہی نہیں میں نے جل کر کہا کہ کتاب تو عرصہ ہوا شائع ہو چکی ہے اور دنیا نے اس کا خیر مقدم کیا ہے۔ پھر مولانا شوکت علی نے مجھ سے کتاب لی اور الٹ پلٹ کر دیکھا اور کہا کہ کل فارسی ہے۔ میں نے کہا "جی ہاں"۔ انھوں نے یہ کہہ کر کتاب واپس کر دی "افسوس"۔ اسی وقت سے میرا یہ خیال ہو گیا کہ مولانا محمد علی اپنے ہمعصروں کیلئے فراخ دل نہیں ہیں، جو واقعی ایک نایاب صفت ہے۔ اور یہ خیال اب تک نہیں بدلا۔

جب میں نے بستی میں وکالت شروع کی تو اس کے بعد مجنوں گورکھپوری نے "اقبال" کے عنوان سے ایک کتابچہ شائع کیا۔ اس میں مجنوں صاحب نے اقبال کی تحقیر میں کوئی دقیقہ اٹھا نہ رکھا تھا۔ اور انھیں زبان سے نابلد اور پنجابی وغیرہ بھی لکھا تھا۔ میں نے اسی وقت چند مضامین لکھے تھے۔ جن میں سے صرف دو رسالے شائع ہوئے بقیہ پڑے رہ گئے۔

وکالت کی مصروفیتوں سے اِدھر توجہ کرنے کی فرصت ہی کب تھی۔ اب یہ خیال گذرا کہ ان سب پر نظرِ ثانی کرکے یا انھیں از سرِ نو ترتیب دے کر ایک مجموعہ شائع کیا جائے۔

اس خیال کی وجہ صرف یہ ہے کہ اگرچہ اقبال پر تصانیف کا انبار لگ گیا ہے لیکن عام فہم زبان میں پیامِ اقبال کی کوئی ایسی شرح مجھے نہیں ملی جو مخصوصین کے علاوہ عام علم و ذہن کے لوگوں کو اقبال سے روشناس کرتی۔ میرا یقین کامل ہے کہ اقبال نے صرف اسلام کی تعلیمات اور اس کے بنیادی نظریات کی تعبیر کی ہے نہ اپنی طرف سے ملایا ہے اور نہ کچھ کم کیا ہے۔ یہی باتیں وہ نثر میں بھی کر سکتے تھے لیکن اپنی عظیم شعری صلاحیتوں کے باعث انھوں نے نظم کا راستہ اختیار کیا کہ یہ زیادہ موثر اور دل گداز ہے۔

اقبال فلسفۂ شرق و مغرب کا ماہر تھا مگر اس کے کلام پر فلسفہ کی نہیں قرآن و حدیث کی چھاپ ہے۔ وہ بڑے اعتماد کے ساتھ فلسفہ کے بارے میں گفتگو کرتا ہے۔ اور پھر اسے یہ کہہ کر رد کر دیتا ہے کہ ؎

انجام خرد ہے بے حضوری ہے فلسفہ زندگی سے دوری

اسے فلسفی یا شاعر عرفِ عام کے معنوں میں قرار دینا سخت غلطی ہے۔ وہ دراصل ایک مجدد تھا اور اس نے مجمی تخیلات اور غیر اسلامی افکار کو رد کرکے خالص اسلام پیش کرنے کے لئے اردو اشعار لکھے ہیں۔ اور وہ اپنی کوشش میں پوری طرح کامیاب ہے۔ مگر معلوم نہیں کیوں اس صاف سادہ اور سچی بات کو کہنے سے لوگوں نے یا تو قطعی گریز کیا ہے یا اگر کیا ہے تو ضمناً۔ حالانکہ اُسے صراحت سے کہنے اور اُجاگر کرنے کی ضرورت

ہے۔ تاکہ پیغام اقبال کی بام ذہنوں تک رسائی ہو۔ مثنوی مولانا روم کے لئے کہا گیا تھا کہ ؎

مثنوی مولوی معنوی ہست قرآن در زبانِ پہلوی

یہی حیثیت کلام اقبال کی ہے۔ اور میں نے سوچا کہ کلام اقبال کو پیغام اسلام کے حق میں گھر گھر اور در در پہنچانے کے لئے میں اپنی تمام بے بضاعتیوں کے باوجود ایک کوشش کروں تاکہ مجھ سے کوئی بہتر شخص اس موضوع پر زیادہ وضاحت زیادہ یقین و اعتماد اور زیادہ اہمیت سے گفتگو کر سکے۔

اقبال کی زندگی میں بہت سے تغیر و تبدل آئے۔ اور مختلف زمانوں کے۔ ان کے کلام میں یہ تغیرات نمایاں ہیں اور ان کو انھوں نے چھپانے کی بھی کوشش نہیں کی۔ ایک وقت ان پر ملک وطن کا بھی گذرا ہے خود فرماتے ہیں ع

مدتہا بودم گرفتارِ شکے

اور شاید یہ وہی زمانہ ہے جب انھوں نے "ترانہ ہند" اور "نیا شوالا" وغیرہ لکھا ہے۔ پھر "سلی" کی نظم سے ان میں ایک انقلاب آیا ہے اور اس انقلاب کا پھر انقلاب نہیں ہوا اور برابر ان کے جذبۂ ایمان و اسلام کو جلا ہوتی گئی۔ ان کے اشعار میں حقیقت پسندی اور ان کے جذبۂ محبت رسول صلعم میں صداقت اور خلوص کوٹ کوٹ کر بھرا ہے لیکن ان کا یہ مصرعہ بھی بے معنی نہیں معلوم ہوتا کہ ؎

ہے اس کی طبیعت میں تشیع بھی ذرا سا تفضیل علی ہم نے سنی اس کی زبانی

اسرارِ خودی ان کی پہلی معرکۃ الآرا کتاب ہے جس میں انھوں نے اسلام

کے بنیادی عقائد کو پیش کیا ہے۔ اس میں نیابت الٰہی یا رسالت کے بعد فوراً "ورِ شرح اسماءِ حضرت علی مرتضیٰ ؓ" شروع کر دیا ہے۔ ۔۔۔۔ ۔۔۔۔ اور تین خلفا کو چھوڑ دیا ہے۔ اور اس کے معنی کون نہیں جانتا کیا ہیں لیکن رموزِ بیخودی میں جس جذبۂ صادق سے حضرت ابوبکر صدیق ؓ کی مدح کی ہے اور پھر بعد کی نظموں جن میں عظیم بالشان الفاظ میں خلفاءِ ثلاثہ کا ذکر کرتے رہے ہیں۔ وہ اپنی آپ مثال ہیں۔ مقام شک سے مقام یقین تک پہنچنے کے لئے اقبال پر یہ مصرعہ ہر طرح موزوں ہے۔ ع

اندکے اندک عشق اندر آورد بیگانہ را

اور اس میں ان کی کوئی کسرِ شان نہیں ہے۔ کیونکہ وہ مقلد نہ تھے مجتہد تھے۔ وہ رسمی مسلمان نہ تھے کہ اسلامی گھرانے میں پیدا ہونے سے مسلمان ہو گئے ہوں بلکہ تحقیق و اجتہاد حیات و کائنات کے مطالعہ سے اسلام کی سچائی تک پہنچے تھے۔

میرا جو حقیر مطالعہ اقبال کا ہے اس کی بنا پر میں کہہ سکتا ہوں کہ اپنے متعلق جو انھوں نے کہا تھا کہ۔ ع

مجموعۂ اضداد ہے اقبال نہیں ہے

وہ آخر تک سچ رہا۔ مجھے تو تین اقبال نظر آتے ہیں۔ ایک گوشت پوست والا اقبال، دوسرا اقبال شاعر اور تیسرا اقبال فلاسفر۔ مادی اقبال شاعر اقبال سے قطعی مختلف ہے۔ وہ خود کہتا ہے ؎

اقبال بڑا اپدیشک ہے من باتوں سے موہ لیتا ہے
گفتار کا یہ غازی تو بنا کردار کا غازی بن نہ سکا

ایک دن علامہ اقبال نے مجھ سے کہا کہ آپ وسط ایشیا میں جاکر

کام کیجئے۔ یہ وہ زمانہ تھا جب وسطِ ایشیا روس اور اسلامی اقتدار کی کشمکش میں تھا اور آخر کار انور پاشا یہیں لڑتے ہوئے شہید ہوئے ہیں خاموش رہا تو خود فرمایا کہ آپ دریافت کریں گے کہ میں خود وسطِ ایشیا کیوں نہیں جاتا۔ تو اس کی وجہ یہ ہے کہ میرے اندر جذبہ ہے لیکن ہمت کی کمی ہے۔ نماز کے بارے میں یہ کہنے والا کہ ؎

سطوتِ توحید قائم جن نمازوں سے ہوئی
وہ نمازیں ہند میں نذرِ برہمن ہوگئیں

اپنے بارے میں کہتا ہے ؎

جو بے نماز کبھی پڑھتے ہیں نماز اقبال
بلا کے دیر سے مجھ کو امام کرتے ہیں

جس دن میں جیل سے رہا ہوا اسی دن مولانا عطاء اللہ شاہ بخاری بھی جیل سے نکلے تھے۔ شفاعت اللہ خانصاحب مینیجر اخبار "زمیندار" کے مکان پر ۲ بجے رات تک نشست رہی۔ عطاء اللہ شاہ بخاری کی دلچسپ گفتگو موضوع سے بے تعلق تسلسل کے ساتھ جاری تھی۔ اسی میں علامہ اقبال کا بھی ذکر آگیا۔ عطاء اللہ شاہ بخاری نے اپنے مخصوص انداز میں مزاحاً لیکن جس میں محبت کی شیرینی شامل تھی کہا کہ اس کی کیا بات کرتے ہو۔ اس کی شان میں تو کلام پاک کی آیت یقولون مالا یعقلون ہے۔ دراصل جن لوگوں نے کسی شاعر کے کلام کو اس کے عمل سے علیحدہ کرنے کی کوشش کی ہے۔ ان کو بہت دور از کار دلائل سے کام لینا پڑا ہے۔ لیکن ناقدینِ فن کے لئے یہ رواج سا ہوگیا ہے کہ وہ کلام شاعر کو اس کی ذاتی احوال و کوائف سے علیحدہ تصور کرتے ہیں۔ یہ صحیح ہے

کہ شاعر نبی یا پیغمبر نہیں ہوتا لیکن اگر اپنے حالات اور ماحول کی فضاؤں کو وہ عبور نہ کر سکے تو اس کا فن ناقص ہے اور اسی لئے مرزا غالب نے کہا ہے کہ ؎

سخن چہ ننگ ز آلودہ دامنی دارد

افکار و خیالات کی دنیا میں بھی اقبال کے اندر وہی تضاد موجود ہے۔ اقبال کونسل کے ممبر تھے۔ جہاں انھوں نے مسلمانوں کے معاملات کو پیش پیش رکھا۔ وہ مسلم لیگ کے صدر ہوئے اور خطبۂ صدارت میں پاکستان کا تخیل پیش کیا اور یہ کہا جا سکتا ہے کہ اقبال تقسیم ہندوستان کے بانیوں میں ہیں۔ لیکن کلام اقبال میں اس کا ادنیٰ سا اشارہ بھی نہیں ملتا۔ میں نے ایک رسالہ "اقبال اور حب الوطنی" لکھا تھا جو طبع بھی ہو چکا ہے۔ اس میں اس نے تفصیل سے اس موضوع پر بحث کی ہے اور اسی رسالے میں میں نے چیلنج کیا تھا کہ کلامِ اقبال میں ایک شعر بھی پاکستان کی موافقت میں نہیں مل سکتا ہے۔ کلام اقبال میں حبِ وطنی یعنی ہندوستان سے محبت اور غداران وطن سے نفرت کا اپنا ایک مقام ہے اور جن پر شوکت الفاظ میں انھوں نے مادرِ ہند کی تصویر کھینچی ہے وہ کلام اقبال کے اس موضوع پر خلوص و کیفیت کی ایک نمایاں مثال ہے۔ تمکین ناقد آزاد نے بھی اس معاملے پر سیر حاصل بحث کی ہے۔

یہی حال اقبال کے افکار فلسفیانہ کا ہے اور اگر تعمق سے کام لیا جائے تو نظریہ پاکستان بھی فلسفۂ سیاست کا ایک جزو تھا۔ اسی طرح ۱۹۲۹ء میں جو مدراس لکچر بعنوان تشکیل جدید افکار اسلام طبع ہوئے ہیں ان کو بھی کلام اقبال سے تمیز کرنا پڑے گا۔ یہ تقریریں پہلے انگریزی

میں شائع ہوئی تھیں۔ ان کے ترجمے کے لئے حضرت مولانا عبدالماجد صاحب دریابادی سے جب کہا گیا تو موصوف نے ان تقریروں کے بعض اور خمنی رجحانات سے اختلاف کرتے ہوئے کہا تھا کہ ابھی تو ان کو ہندوستان میں صرف نصف درجن آدمی سمجھ سکتے ہیں۔ ان کا اردو میں ترجمہ کر کے عام کرنا ہرگز مناسب نہیں ہے۔ بعد ازاں کچھ ترجمہ ہوا۔ لیکن جن لوگوں نے ان افکار کو کلام اقبال کی شرح کی بنا قرار دیا ہے، انھوں نے کلام اقبال کے ساتھ انصاف نہیں کیا۔

اسی کے ساتھ یہ بھی غور طلب ہے کہ بنیادی عقاید و تصورات میں کہیں لغزش نہیں ہے۔ توحید، رسالت، خلافت، ارکانِ خمسہ، نماز، روزہ، حج اور زکوٰۃ، جہاد فی سبیل اللہ۔ وغیرہ وغیرہ سب بدستور الانسان میں بھی محفوظ ہیں اور ان کے دلایل عقلی پیش کئے گئے ہیں۔ ان دلایل کے بارے میں مجھ جیسا کم علم تو کچھ نہیں کہہ سکتا لیکن یہ تو مسلّم ہے کہ جب کسی حقیقت کے لئے دلیلیں تلاش کی جائیں تو ہمیشہ ترمیم و ترقی کی گنجائش باقی رہتی ہے۔ اور ممکن ہے کہ ایسے موقع پر خود اقبال کا قطعہ ان پر صادق آئے۔

فلسفی را با سیاست داں بیک میزاں مسنج
چشم آں خورشید کورے دیدۂ ایں بے نمے
آں تراشد بہرِ حق را حجتے نا استوار
ایں تراشد بہرِ باطل را دلیلِ محکمے

آخر سوچنے کی بات یہ ہے کہ جو شخص قتلِ مرتد کو جائز قرار دے اور اس کی حمایت میں مضمون لکھے وہ ابلیس کے قصے کو اپنی تحالوجی

کیسے قرار دے سکتا ہے۔ ہم کو یا تو اس کی کوئی تاویل کرنی پڑے گی یا غیر متعلق اور ضمنی قرار دے کر نظر انداز کر دینا ہو گا۔ یا یہ ماننا پڑے گا کہ کہیں کہیں اقبال کے فلسفیانہ تصورات اور کلام میں تضاد ہے۔ یہ بات بھی ذہن میں رکھنے کی ہے کہ اقبال نہ تو کسی سیاست کا علمبردار ہے اور نہ اسلام کے بے شمار فرقوں میں کسی خاص فرقہ کا مبلغ وہ اسلام کے بنیادی اصولوں کی شرح کرنے اور مغرب زدگی اور لگیت سے نجات دلانے کے لئے اٹھا ہے۔ وہ تقلید جامد کا ہم نوا نہیں اور تحقیق و اجتہاد کا پیامبر ہے۔ اس لئے اس کے کلام میں کسی وقتی سیاسی معاملے یا کسی جزوی اختلافی شرعی مسئلے کو تلاش کرنا عبث ہے۔ وہ حیات و کائنات کا راز آشکارا کرنے کے لئے نکلا اور اسے حقائق اسلام میں سب کچھ مل گیا اس نے نجات و فلاح انسانیت کو اسلام اور صرف اسلام کی تعلیمات میں مضمر پایا اور اس کا کلام اسی کی شرح ہے۔

عمرہا در کعبہ و بتخانہ می نالد حیات
تا ز بزم عشق یک دانائے راز آید بروں

بیروں از گنبد در بستہ پیدا کردہ ام راہے
کہ از اندیشہ برتر می پرد آہ سحر گاہے

اس لئے اقبال کے ناقدین کا صرف ایک حل ہے کہ کلام اقبال کو نہ ان کے ذاتی اعمال سے جانچا جا سکتا ہے اور نہ ان کے فلسفیانہ افکار کے ترازو پر تولا جا سکتا ہے۔ کلام اقبال صرف EXPOSITION OF ISLAM (اسلام کی تشریح) ہے اور یہی وہ اصل حقیقت ہے جسے نمایاں کرنے کے لئے میں نے چند اوراق کو مرتب کیا ہے۔ اس کے ساتھ جب یہ بات بھی شامل کر لی جائے کہ اقبال کے خیالات میں برابر تغیر ہوتا رہا ہے۔ اور ان کا کلام علی حیات

سے کوئی تعلق نہیں رکھتا تو کسی قسم کا ابہام باقی نہیں رہتا ہے۔ جہاں تک اقبال کے شاعرانہ کمالات یعنی اندازِ بیان ندرتِ ادا مصوری و موسیقی کا سوال ہے تو ان کے معترف تو وہ لوگ بھی ہیں جو کلام کے اصل پہلو یعنی اس کے مغز پر پردہ ڈالنا چاہتے ہیں۔

ع ایک ولولۂ تازہ دیا میں نے دلوں کو — لاہور سے تا خاکِ بخارا و سمرقند

مجھے اپنی کوتاہیوں کا علم بھی ہے اور احساس بھی۔ لیکن جب اقبال کا "ادبی نصب العین" تسلسل کے ساتھ ہفتہ وار "ندائے ملت" میں شائع ہوا تو بعض ممتاز علماء نے مجھ سے کہا کہ اول بار وہ اقبال سے روشناس ہوئے۔ اس سے میری ہمت افزائی ہوئی اور میں نے "کلامِ اقبال" کو عام کرنے کی کوشش کا فیصلہ کیا اور یہ کتاب اس کا نتیجہ ہے۔ اگر اس سے کچھ نیم تعلیم یافتہ لوگوں میں بھی اسلام کی روح کو سمجھنے کے لئے کلامِ اقبال کے مطالعہ کا ذوق پیدا ہو گیا تو مجھے بھی روحانی سرور حاصل ہوگا اور میں سمجھوں گا کہ میری سعی بارآور ہوئی۔

قاضی محمد عدیل عباسی
۲۲ مئی ۱۹۶۹ء

اقبال کا ادبی نصب العین

کسے خبر کہ سفینے ڈبو چکی کتنے
فقیہ و صوفی و شاعر کی ناخوش اندیشی

مجھے "ادبی نصب العین" کا عنوان خود اقبال کے "دیباچہ اسرار خودی" (اشاعت بار دیگر) سے حاصل ہوا۔ علامہ اقبال نے جب اول بار اپنے فارسی کلام کا پہلا مجموعہ "اسرار خودی" کے نام سے شائع کرایا تو اس میں خواجہ حافظ پر سخت لہجہ میں نکتہ چینی کی تھی۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں ؎

ہوشیار از حافظ صہبا گسار — جامش از زہر اجل سرمایہ دار
گوسفند است و نوا آموخت است — عشوہ و ناز و ادا آموخت است
آں فقیہ ملت مے خوارگاں — آں امام امت بے چارگاں
آں پنداں مست شراب بندگی است — خواجہ محروم ذوق خواجگی است
نعرہ زن با عرفی ہنگامہ خیز — زندہ با صحبت حافظ گریز

حافظ چونکہ اشاروں کنایوں میں شراب و مستی کی تشبیہات کو صرف

الٰہی و عرفان محبت کا پیام بر تصور کیا گیا ہے اور عام طور پر صوفیائے کرام اس کے بادہ و ۔۔۔ ے خانہ کو ورود تجلیات حقیقۃ الحقائق کے لئے استعارہ قرار دیا ہے۔ اس لئے اقبال کے خلاف تمام ہندوستان میں ایک طوفان بپا ہوگیا اور اخبارات و رسائل میں اس حصۂ نظم کی سخت مذمت کی گئی۔ اس مخالفت کے کاروانِ سالار خواجہ حسن نظامیؒ تھے اور انھوں نے اقبال کی حافظ پر نکتہ چینی کو تصوف سے عناد اور مسلمانوں میں دنیوی ترقی کے فروغ کی خواہش پر محمول کیا۔ یہ سلسلہ ایک عرصہ تک جاری رہا مگر اس تمام ہنگامہ آرائی میں کوئی ذائقہ نہ پیدا ہو سکا۔ کیونکہ علامہ اقبال نے کامل سکوت اختیار کیا تا آنکہ "اسرارِ خودی" کی دوسری اشاعت ہوئی اور بار دیگر اشاعت میں یہ اشعار کلام سے حذف کر دیئے گئے تھے۔ علامہ اقبال کا اگر کوئی جواب شائع ہوا تو وہ اس دوسرے ایڈیشن کا دیباچہ تھا جو جواب کم اور اعتذار زیادہ تھا۔ انھوں نے لکھا تھا کہ حافظ پر میری تنقید کسی اور وجہ سے نہ تھی، اور نہ اُن کی ذات پر حملہ تھا صرف اُن کے کلام کے "اونی نصب العین" پر اعتراض کرنا مقصود تھا مگر چونکہ سخت قسم کی غلط فہمیاں پیدا ہو گئی ہیں۔ اس لئے میں ان اشعار کو اپنے کلام سے نکال دیتا ہوں اور تب سے آج تک یہ اشعار طبع نہیں ہوئے۔ اس تمام دور میں میرا خیال تھا کہ "اونی نصب العین" کی چونکا دینے والی اصطلاح کے بارے میں علامہ اقبال کا جائزہ لوں مگر یہ کام سخت مشکل تھا۔ میری تہی مائگی، اچھے کتب خانوں سے بُعد اور وقت کی کمی کے باعث بہت سی دشواریاں حائل رہیں۔ مگر وقت ہے کہ گذرا چلا جاتا ہے۔ آج خیال گذرا کہ جو کچھ اَثنائے سرسری طور پر ان دنوں کے غور و فکر سے دماغ میں یکجا ہوا ہے اُسے نقشِ اوّل کے طور پر پیش کر دوں۔

ہو سکتا ہے کہ کوئی صاحب نظر و علم و فکر و قلم اس موضوع پہ سیر حاصل بحث کر سکے۔

●

ادبی نصب العین کا مفہوم

شعر و شاعری نے ابتدائے آفرینش سے انسانی ذہن و خیال کو متاثر کیا ہے اور عالم میں جو بڑے بڑے کام انسان کی رفعت و اصلاح اور اس کی جسمانی، روحانی اور دماغی ترقی کے ہوئے ہیں۔ ان سب میں شاعری نے ایک اہم کردار ادا کیا ہے۔ یہ کہنے میں مبالغہ نہ ہوگا کہ ہر نیک اور عظیم کارنامہ کے لئے۔ اس کی اولین بنیاد یعنی اس کی ابتدائی تحریک کو شاعر کے نغموں نے تعمیر کیا ہے۔ مذہب جو کسی نہ کسی طرح سارے عالم پر چھایا ہوا ہے۔ اس کی زبان رہی ہے اور اس کا شاعری سے گہرا تعلق شروع سے رہا ہے۔ وید جو دنیا کی قدیم ترین اور الہامی کتاب کہی جاتی ہے نظم میں ہے۔ رامائن جسے کروڑوں انسان روزانہ پڑھتے اور اس پر وجد کرتے ہیں شعر و نغمہ ہے۔ قرآن اگرچہ نثر میں ہے لیکن اس کی زبان اس درجہ پرکیف ہے کہ ابتداء میں مخالفین اسلام اسے شاعری کہا کرتے تھے۔ ایک فقرہ ملاحظہ ہو۔

"بعض انسانی دل پتھر کی طرح سخت ہوتے ہیں بلکہ اس سے بھی زیادہ کیونکہ پتھر تو پھٹ جاتے ہیں اور ان سے چشمے ابلتے ہیں لیکن بعض انسانوں کے دل نہیں پسیجتے" احادیث کا بھی یہی حال ہے۔ ایک فقرہ اس کا بھی گوش گذار کرتا ہوں: "اے امتی جلدی کرو نیک کام کرنے میں ان فتنوں کے آنے سے پہلے جو اس طرح آتے ہیں جس طرح آسمان پر ابر کے ٹکڑے آتے ہیں" اصلاح اخلاق تزکیۂ نفس، سادگی، بلند فکری، نیکی اور احسان، صبر و مروت، خوش خلقی و پاکیزگی، ایثار و قربانی، خدمت خلق، عفو و درگذر الغرض جتنے بھی انفرادی اعمال صالحہ ہیں، وہ سب مدعائے تصوف میں داخل ہیں اور تصوف ہمہ تن شاعری ہے۔ سود اس دکھیر داس کے بھی گائے جا رہے ہیں، مثنوی مولانا روم متقشف علماء بھی سے پڑھ رہے ہیں ـــــــــ نعت خوانی دین اسلام کا جزو بن چکی ہے۔ بڑے بڑے زاہدان خشک مدینۂ منورہ کا تصور کرتے ہی شعر کی دلکشی کے دائرے میں آجاتے ہیں۔ جامی اور حافظ شمس تبریز، عثمان ہارونی۔ نصیر الدین چراغ دہلوی، میرزا مظہر جانجاناں اور بے شمار صوفیہ معرفت الٰہی کی سرمستی شعر و نغمہ میں کھو گئے۔ قوالی بعض کے نزدیک ایک مذہبی رسم قرار پائی۔ سینکڑوں اولیاء کرام کے مزاروں پر سالانہ عرس ہوتے ہیں اور سماع کی محفلیں ذوق و شوق سے منعقد کی جاتی ہیں جن میں خدا جویان حق آشنا بے ہوش ہو کر رقص کرتے ہیں۔ ایک دن مولانا حسرت موہانی نے دوران گفتگو میں مجھ سے کہا کہ بزم سماع میں ایک شعر سے جو رفعت روحانی انسان کو حاصل ہو جاتی ہے وہ سالہا سال کی عبادت سے حاصل نہیں ہوتی۔

رزم میں بھی شاعری کا مقام بزم سے کم نہیں رہا ہے۔ زمانہ قدیم

میں مختلف ملکوں کے اندر یہ رواج رہا ہے کہ عورتیں میدانِ جنگ میں موجود رہتی تھیں اور جوش دلانے والے اشعار پڑھ کر مردوں کا دل بڑھاتی تھیں۔ ہر ملکی جدوجہد اور ہر انقلاب کی پشت پر کسی شاعر کی پکار کارفرما رہی ہے۔ اس کی للکار نے کمزور حق کو مضبوط باطل سے ٹکرا دیا اور یہ اسی وجدان کا طفیل تھا کہ باطل پاش پاش ہو گیا۔ خود اقبال کے کلام میں اس کی مثالیں کثرت سے ملتی ہیں ؎

خوفِ باطل کیا کہ ہے غارت گرِ باطل بھی تو

اٹھ کہ خورشید کا سامانِ سفر تازہ کریں — نفسِ سوختۂ شام و سحر تازہ کریں

یا گنبدِ افلاک میں تکبیرِ مسلسل — یا خاک کے آغوش میں تسبیح و مناجات

وہ مسلکِ مردانِ خود آگاہ و خدا مست — یہ مسلکِ ملا و جمادات و نباتات

انسان کو انسان جانوروں تک کو شاعری نے مغلوب و سرمست کیا ہے۔ عرب میں حدی اس نغمہ کو کہتے ہیں جو شتربان اپنے ناقہ کو تیز گام ہونے کے لیے الاپتا ہے جس سے اونٹنی مدہوش ہو کر دوڑنا شروع کر دیتی ہے چنانچہ ایک عاشقانِ رسولؐ کا قافلہ مدینہ کی جانب جا رہا ہے اور ساربان سے کہہ رہا ہے ؎

ساربان یاران بہ یثرب ما بہ نجد
آن حدی گو ناقہ را آرد بہ وجد

یعنی اے ساربان میرے احباب تو مدینہ پہنچ گئے اور میں ابھی نجد میں ہوں۔ ایسا نغمہ گا کہ اونٹنی مست ہو کر دوڑنا شروع کر دے تاکہ ہم جلد پہنچ جائیں۔

شاعری سراسر وجدان و کیف، محرکِ جذبات اور تلاشِ حق ہے۔

نقادانِ فن کے پاس جا کر اس میں صنائع و بدائع، نکتہ آفرینی، نازک خیالی، تمثیل کی ندرت اور اس طرح کی بہت سی باتیں جانچی اور پرکھی جاتی ہیں اور بیچارہ شاعر فریاد کرتا ہے کہ شعر مرا بمدرسہ کہ برد۔ اصل حقیقتِ شعر یہ ہے کہ وہ حیات و کائنات کے بارے میں کوئی مستحکم فکر دیتا ہے۔ وہ انسان کے دل پر چوٹ مارتا ہے اور اسے عمل کے جوش میں لاتا ہے۔ اسے ناامیدی میں ڈھارس، مصیبت میں تسکین، مشکلات میں، مقابلہ اور حالات بد میں ہمت دلاتا ہے۔ اور خود آگاہی کی لذت بخشتا ہے۔ کون سادہ انسان ہے جسے روزمرہ اسے اپنے ذاتی معاملات اپنے فکر و نظریۂ عالم اپنے ذوقِ خدمتِ خلق اور خود اپنے نفس کے محاسبہ کے لئے ایسے حالات کا سامنا نہیں ہوتا۔ جہاں اسے صاف دماغ سے ایک بات سمجھنے اور اس پر کوئی فیصلہ کر کے عمل کرنے اور اپنے آپ کو غلط روی سے روکنے اور معرکۂ حق و باطل میں اپنے جذبات کو برتنے اور سود و زیاں بتانے کی ضرورت نہ ہوتی ہو۔ ان سب معاملات میں ایک واعظ کی تقریر، ایک فلسفی کے تصورات، ایک حکیم کے اقوال سے زیادہ شاعری اس کی مدد کرتی ہے۔ اور یہی وہ جگہ ہے جہاں ایک عامی جو محاسنِ شاعری کی فنی باریکیوں سے ناواقف ہوتا ہے، شاعر کے فکر و وجدان و کیف سے استفادہ حاصل کرتا ہے اور اسی لئے کہا گیا ہے کہ "شاعری جزویست از پیغمبری"۔

الغرض شعر ایک عجیب و دلکش چیز ہے۔ انسانی افکار و جذبات کو جتنی چیزیں متاثر کرتی ہیں، ان میں شعر کا درجہ سب سے بلند ہے ؎

صد نالۂ شبگیرے صد صبح بلاخیزے　　صد آہِ شرر ریزے ایک شعرِ دل آویزے

شعر کی جادو گری کے بے شمار واقعات ہیں اور یہ ہمارے روزمرہ کے تجربات میں شامل ہے۔ صرف دو ایک کا تذکرہ کرنا مناسب ہوگا کیونکہ مثالوں سے حقیقتیں بہتر طریقہ پر ذہن نشین ہو جایا کرتی ہیں۔ اگرچہ جو مثالیں میں پیش کروں گا وہ پرانی اور عام واقفیت کی ہیں اور ان میں کوئی جدت نہیں ہے۔ لیکن موضوعِ سخن کے لئے موزوں ہیں۔

مشہور واقعہ ہے کہ فارسی کا پہلا شاعر رودکی جو مغنی بھی تھا اور نابینا بھی۔ بخارا کے بادشاہ کے دربار میں رہتا تھا اور ہر روز بادشاہ کو گاکر اپنا کلام سنایا کرتا تھا۔ ایک دن بادشاہ اپنے وزراء و امراءؔ خدام وغیرہ کے ساتھ سیر و شکار کرتا ہوا ایک ایسے مقام پر جا پہنچ گیا جہاں چشمے جاری تھے اور سبزہ زار تھا۔ مناظرِ فطرت ایسے دلکش اور دلربا تھے کہ وہاں سے جانے کو جی نہ چاہا اور تلونِ طبعی بادشاہان پر عمل کر کے بادشاہ وہیں مقیم ہو گیا وہ بخارا واپس ہونے کا نام نہیں لیتا تھا۔ امراء و خدام دربار عاجز آ کر آخر کار رودکی کے پاس پہنچے روزانہ دوپہر کے کھانے کے بعد جب بادشاہ قیلولہ کرتا تھا تو وہ ستار پر کچھ اشعارؔ گاکر سناتا تھا۔ ایک لاکھ روپیہ لوگوں نے نذر کرنے کو کہا۔ رودکی کو اپنے فن پر اتنا اعتماد تھا کہ اس نے سب کو آگاہ کر دیا کہ تیار رہیں چنانچہ اس دن اس نے اپنا وہ معرکۃ آرا قصیدہ گایا "جو آید ہمے" کی ردیف کے ساتھ شہرۂ آفاق ہے۔ اس نے بادشاہ کا بخارا میں داخلہ اور وہاں کا خیر مقدم کچھ اس طرح نظم کیا تھا کہ بادشاہ متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا اس کا ایک شعر حسبِ ذیل ہے ؎

اے بخارا شاد باش و شاد زی　　　شاہ سویت میہماں آید ہمے

چنانچہ بادشاہ فوراً وہاں سے بھاگا۔ اصطبل میں جاکر خود گھوڑے پر زین کسی اور اس وقت تک باگ نہیں کھینچی جب تک بخارا پہنچ نہ گیا۔ یہ ہے شعر کا سحر انگیز اثر۔ اسی طرح حفیظ جالندھری لندن گئے وہاں جو پنجابی ہندو مسلمان موجود تھے۔ انھوں نے ان کی چائے پر دعوت کی کسی نے کہہ دیا کہ ان لوگوں میں بہت سے عرصے سے لندن میں پڑے ہوئے ہیں گھر نہیں جاتے اور ان کی بیوی بچے پریشان ہیں چنانچہ حفیظ نے اس موقع کے لئے ایک نظم لکھی ؎

اپنے وطن میں سب کچھ ہے پیارے

اس کے چند شعر ملاحظہ ہوں۔

وہ بھولی بھالی بچوں کی مائیں
داسن میں جن کے ٹھنڈی ہوائیں
چھوڑا ہے ان کو کس کے سہارے
اپنے وطن میں سب کچھ ہے پیارے

فوراً لوگوں نے پروانۂ راہداری کے لئے درخواستیں دیں اور وطن کی محبت کا جذبہ موجزن ہو گیا اور پردیسی دیس سدھارے۔

شعر کو دلآویز بنانے کے لئے تین چیزیں درکار ہیں (۱) مفہوم (۲) حسن کلام اور (۳) حسن بیان۔ مفہوم وہ پیام ہے جو شاعر دانستہ یا نادانستہ لوگوں کے دلوں میں اتارنا چاہتا ہے۔ یہ اصل چیز ہے یعنی یہ کہ وہ کہنا کیا چاہتا ہے۔ حسن کلام اور حسن بیان طرز ادا سے کام ہے یعنی وہ اپنی بات کہنے کے لئے کس طرح کے الفاظ استعمال کرتا ہے اور کس ڈھنگ سے کہتا ہے۔ اگر ایسی سے اچھی بات کہنے کے لئے شاعر کے پاس زبان و الفاظ کی

شگفتگی اور طرزِ ادا کی ندرت نہیں ہے۔ تو اس کا شعر پھیکا رہ جائیگا۔

●

اقبال اور حافظ

حافظ کے کلام میں حسنِ کلام اور حسنِ بیان اور شاعرانہ محاکات تو بدرجۂ اتم موجود ہیں۔ حافظ کی رنگین بیانی و تصویر کشی ناقابلِ انکار ہے۔ ایک دن مولانا حسرت موہانی ایک فارسی کا شعر کانپور میں اپنی دوکان پر گنگنا رہے تھے۔ مولانا آزاد سبحانی بھی موجود تھے سن کر بےخود ہوگئے اور پوچھا کس کا کلام ہے۔ مولانا حسرت نے کہا کہ سوائے حافظ رنگین بیان کے اور کس کا ہوسکتا ہے۔ اگر ایسا قادر الکلام اور سحر نگار سے

شراب و ساقی و آبِ رواں و روئے نگار

کی عکاسی کرنے لگے تو اختلاف نمودار ہوسکتا ہے ورنہ ایک حالی تو ناقابلِ توجہ ہوتا ہے۔ حافظ کے کلام کے بارے میں اقبال کا خیال یہ تھا کہ وہ دنیا سے بیزاری اور غوغائے عالم سے فرار کی راہ اختیار کرتا ہے۔ اور اس طرح وہ یا تو عیش و تن آسانی کی تعلیم دیتا ہے یا اس تصوف اور فقر کی

جو گوشہ نشینی اور خاک کی آغوش میں تسبیح و مناجات یعنی جہاد عالم سے روگردانی ہے ؎

دمے باغم بسر بردن جہاں یکسر نمی ارزد
بمے بفروش دلق ما کزیں بہتر نمی ارزد
بمے سجادہ رنگیں کن گرت پیر مغاں گوید
کہ سالک بے خبر نبود ز راہ و رسم منزلہا

"سکون پرستی راہب" کا وہ نقطۂ کمال جو غالب کے زمانے میں عام ہو چکا تھا اور جسے حاصلِ زندگی خیال کیا جاتا تھا۔ اس کا خوشی حافظ کے کلام سے اس طرح ملتا تھا کہ اُسے باضابطہ درس و مطالعہ میں شامل کر دیا گیا تھا اور اقبال نے "اولی نصب العین" سے یہی مراد لیا تھا کہ حافظ کے کل کلام کا قلوب انسانی پر کیا اثر مرتب ہو رہا ہے یعنی اس کے پیام کا نچوڑ کیا ہے۔ اگرچہ اقبال کو یہ خوب معلوم تھا کہ حافظ جگہ جگہ جرأتِ رندانہ اور مبکار کا بھی امام ہے ؎

بیا تا گل برافشانیم و مے در ساغر اندازیم
فلک را سقف بشگافیم و طرح دیگر اندازیم

اقبال کا دور ایک خاص مزاج رکھتا ہے۔ اقبال کے دور میں عالم اسلامی کی عام تباہی اور ملک و وطن کی غلامی رگوں میں خون کو گردش دے رہی تھی اور مختلف جماعتیں اپنے اپنے لائحہ عمل کے ساتھ دار و رسن کو دعوت دے رہی تھیں ع باجاں رسد بہ جاناں یا جاں ز تن برآید کا عام نعرہ تھا۔ اس لئے شراب و ساقی و مہتاب و رعنائی و روئے نگار کی جانب توجہ کرنے کی فرصت نہ تھی۔ کلام شاعری میں مبکار، للکار، جرأتِ رندانہ و

فرزانش ستانہ کی تلاش تھی سیاسیین اور مفکرین کے ساتھ ادیب و نقاد بھی اس سے مستثنیٰ نہ رہے اور یہ زمانے کا اثر تھا اس نے مولانا ابوالکلام آزاد اور پروفیسر ناصر الدین الٰہ آباد یونیورسٹی اور بہت سے کلام فارسی کے ماہرین عرفیؔ و نظیریؔ کے قدرداں ہو گئے تھے اور حافظ سے اجتناب رکھتے تھے۔ مولانا ابوالکلام نظیری کو "فطرت نگار نشاپور" کہنے کے عادی تھے تحریر آپ کیجئے ذرا ایک جگہ نظیری اور حافظ کا اسی نقطۂ نظر سے مقابلہ کر دیں۔

عبادت سحری را مکن نظیری کم
کہ ہر چہ کرد دعاہائے نیم گاہی کرد

یعنی اے نظیری عبادتِ سحری کو کم نہ کر جو کچھ حاصل ہوا ہے وہ دعاہائے نیم گاہی سے حاصل ہوا ہے۔ کیا عمل سے فرار کا اس سے زوردار سبق کہیں ملے گا۔

برخلاف اس کے حافظ کہتا ہے ؎

دل گفت کہ کام بدعا باز تواں یافت
عمریست کہ عمرم ہمہ در کار دعا رفت

یعنی دل نے کہا کہ کام شاید دعا سے نکل جائے جتنی بھی عمر ہے وہ دعا ہی میں تو گذری ہے۔ یعنی ع تمناؤں سے بنا کرتی ہیں تقدیریں کہیں کام عمل سے ہوگا نہ کہ دعا سے۔ اسی طرح حافظ یہ بھی کہتا ہے ؎

قومے بجد و جہد گرفتند وصل دوست
قومے دگر حوالہ بہ تقدیر می کنند

یعنی کسی قوم نے جدوجہد کی تو وہ مقصد برآری میں کامیاب

ہوگئی اور ایک قوم ایسی بھی ہے جو معاملہ تقدیر کے حوالے کر دیتی ہے۔ دیکھئے عمل کے محرک پر کتنی زبردست طنز ہے۔ اسی طرح جستہ جستہ اشعار کا تقابل کیجئے تو کہیں کہیں نظیری میں بھی قنوطیت اور حافظ میں جا بجا پیام جہد و عمل ملے گا۔ مگر دونوں کے کلام کے مجموعی اثرات مختلف ہیں اور اس سے انکار نہیں ہو سکتا کہ حافظ کا میخانۂ مفہوم عام میں اس صوفی تارک الدنیا کی آماجگاہ تھا جس کی عرش رستا زصرف لاہوت اور ناسوت میں تھی۔ اور جس کا اس عالم آب و گل سے کوئی تعلق نہ تھا۔ اقبال جو مجاہد اعظم تھا جس کی تعلیم کا پیام "پیہم زدن" اور "قوت باطل کیا ہے کہ بے غارتِ محرکال بھی تو اعد جو یہ کہتا ہے ؎

غریب و سادہ و رنگیں ہے داستانِ حرم
نہایت اس کی حسین ابتدا ہے اسماعیل

اور طنز کرتا ہے کہ ؎

صوفی ما چارہ تقدیر ادرم نداشت
طاقتِ عقوعاسۃ ایں عالم نداشت

اور جس نے اپنے مفہوم کی وضاحت کے لئے صوفیائے کرام سے بغاوت کر کے "خودی" کی اصطلاح ایجاد کی یہ کیسے برداشت کر سکتا تھا کہ عوام و خواص خوب و زشت کے امتیاز میں ترک دنیا کو عمل صالح اور ذریعۂ معرفت الٰہی قرار دیں۔ اس نے اس نقطۂ نگاہ سے حافظ پر کڑی نکتہ چینی کی اقبال کی نگاہ میں حافظ اس تصوف کا علمبردار تصور کیا جاتا تھا جو تعطل بے کاری اور بے عملی کا دوسرا نام ہے اور حیات کے معرکوں سے کنارہ کش ہو کر صرف تسبیح و وجود میں گم کر دیتا ہے۔ گویا

کہ وہ اس ذکر و فکر صبح گاہی میں اس طرح مست کرتا ہے۔ جس سے
خانقاہی مزاج پیدا ہو اور دنیا سے مکمل اجتناب پیش نظر رہے جس
کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ دعوتِ خیر اور امر بالمعروف و نہی عن المنکر
کی ایجابی وراثت اللہ ہو اللہ ہو میں غرق ہو کر معدوم ہو جائے۔
یعنی حافظ کے کلام کا اثر جہاد زندگی میں حتیٰ کہ قیام حق و غارتگری
باطل کے منافی تھا۔ یہ تھا کلام حافظ کا بنیادی تصور جس پر اقبال نے
بھرپور ضرب لگائی۔ جب علامہ اقبال نے اسرار خودیؔ کی دوسری
اشاعت میں حافظ پر جو اشعار لکھے تھے۔ وہ نکال دیے تھے تو ہمارے
دوست مولانا غلام رسول مہر جو اخبار زمیندار کے ادارہ میں بزمانۂ
خلافت میرے رفیق تھے اور خود کلام اقبال کے بڑے شیدائی تھے
جوش میں کہا کرتے تھے کہ اقبال نے بزدلی دکھائی مگر یہ ان کے مذہبی
عقائد کا اثر تھا۔ وہ تصوف سے صد درجہ بیزار تھے اور اس کا تو حال
معلوم نہیں اس وقت وہ اپنے غیر مقلد ہونے پر بڑا فخر کرتے تھے۔
ان کے مطالعہ میں ہر وقت امام ابن تیمیہ ابوالکلام آزاد۔ عرفی نظیری
غالب (فارسی) اور اقبال کی کتابیں رہتی تھیں۔ اور اپنے کو وہابی کہنے
کے باوجود غالب کے ساتھ رحمۃ اللہ علیہ ضرور لگاتے تھے۔ مہر صاحب غصے میں
آتے تھے تو اپنے کو وہابی بھی کہتے تھے لیکن اس کے ساتھ وہ بڑے روادار
اور بلند نظر تھے۔ ان کا ساتھ میری زندگی کی بہترین یادوں سے بھرا
ہوا ہے۔ بہرحال یہ تھا اقبال کا نظریہ حافظ کے بارے میں

اقبال

اب آیئے کلام اقبال کا جائزہ لیں۔ اقبال نے جب اس دنیا میں آنکھ کھولی تو دو زبردست طاقتیں مسلم معاشرہ میں کارفرما تھیں اور عوام و خواص کے دماغوں پر چھائی ہوئی تھیں۔ ایک تو مخالفانہ قسم کا تصوف جس کا ذکر اوپر کیا گیا ہے اور اس لئے کہ خانۂ معرفت کے ساتھیوں میں ایک ساقی حافظ بھی تھا۔ اور دوسرے علومِ مغرب کی چکا چوند کر دینے والی کرنیں۔ اس طرح مسلمان دو متضاد حصوں میں بٹے ہوئے تھے یا تو رہبانیت اختیار کر لیتے تھے یا مغرب زدگی۔ اس کو اقبال نے یوں بیان کیا ہے ؎

کہا اقبال سے پیرِ حرم نے
یہ محرابِ منبر سو گیا کون

صدا مسجد کی دیواروں سے آئی
فرنگی بت کدے میں کھو گیا کون

اب دونوں کے خلاف اقبال نے جہاد کی ٹھانی۔ حسنِ کلام اور حسنِ بیان دونوں کا وہ امام تو متفقہ طور پر تسلیم ہی کر لیا گیا تھا۔ چنانچہ وہ ایک

مستقل ارادہ اور نیت لے کر میدان میں کودا۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ اقبال نے جس "ادبی نصب العین" کو اپنا طرۂ امتیاز بنایا اس کے لئے کیا طریقہ کار اختیار کیا۔ لیکن قبل اس کے کہ اس موضوع پر جو اصل بحث ہے کچھ کہا جائے یہ بیان کر دینا ضروری ہے کہ اقبال کے کلام کو ابہام تصوف سے خالی تصور کرنا یا اُسے تصوف سے تہی کرنا یا اُسے تصوف کا مخالف قرار دینا صحیح نہ ہوگا۔ وہ ایک مصلح تھا جو شریعت حقہ کی تعلیمات میں ہی جوہر حقیقت کو دیکھتا تھا اور جہاں جہاں بگاڑ پیدا ہو گیا تھا۔ وہاں وہاں درست کرنا چاہتا تھا۔ مگر وہ خشک مزاج متقشف زاہد بھی نہ تھا۔ سودائے عشق اُس کے سر میں بھی سمایا ہوا تھا اور مستی و جنون عشق میں وہ کسی سے پیچھے نہ تھا۔ چنانچہ ملاحظہ ہو۔

عرش کا ہے کبھی کعبہ کا ہے دھوکا اس پر
کس کی منزل ہے الٰہی مرا کاشانۂ دل
تو سمجھتا نہیں اے زاہد ناداں اس کو
رشک صد سجدہ ہے اک لغزش مستانۂ دل

حضرت محبوب الٰہی نظام الدین اولیاؒ کے مزار پر دعا کرتے ہوئے کہتا ہے :-

فرشتے پڑھتے ہیں جس کو وہ نام ہے تیرا
بڑی جناب تری فیض عام ہے تیرا
ستارے عشق کے تیری کشش سے ہیں قائم
نظام مہر کی صورت نظام ہے تیرا

اقبال کے کل پیغام کا نچوڑ "عشق رسول" ہے اور اس لئے وہ

تب وتاب دل سے کس طرح بیگانہ ہو سکتا ہے اور یہی تب وتاب دل ہے جس پر تصوف کی پوری عمارت کھڑی ہے۔ لیکن وہ زندگی سے فرار بھی اختیار کرنا نہیں چاہتا۔ اپنے مفہوم کو اس نے ایک شعر میں ظاہر کر دیا ہے ؎

اگر نوا میں ہے پوشیدہ موت کا پیغام
حرام میری نگاہوں میں نائے چنگ و رباب

●

"خودی"

اقبال نے اپنے مدعا کو طرح طرح سے ظاہر کیا ہے۔ صبح و شام ستارے، سورج، چاند تمام مناظر فطرت اور ہر شے اور ہر نقطۂ نگاہ سے اُسے اُجاگر کیا ہے اور چونکہ شاعرانہ محاکات کا امام تھا اور الفاظ کو نگینوں کی طرح ثبت کرتا تھا بات سیدھی دل میں اتر جاتی ہے۔ کہیں سے دو اشعار لے لیجئے انتخاب میں دقت نہ ہوگی۔

مشرق خراب و مغرب ازاں بیشتر خراب
عالم تمام مردہ و بے ذوق آرزو است
ساقی بیار و بادہ و بزم شبانہ ساز
ما را خراب یک نگہِ محرمانہ ساز

یعنی مشرق تو خراب ہے اور مغرب اس سے زیادہ خراب ہے

تمام عالم مردہ اور بے ذوق جستجو ہے۔ اے ساقی شراب لا اور بزم شبانہ کو اور ہم کو ایک نگہ محرمانہ سے مست کر دے۔ اسی بزم شبانہ کو سجانے اور نگہ محرمانہ کو عام کرنے کے لئے اقبال نے بالکل نئی تشبیہات اور انوکھے محاورے استعمال کئے ہیں۔ جس سے دنیائے ادب میں انقلاب آگیا اور صرف الفاظ بدل دینے سے یا ان کے معانی تبدیل کر دینے سے ایک دوسری حقیقت آشکارہ ہوگئی۔ ان الفاظ و محاورات میں سب سے پہلے جس کا خیال آتا ہے وہ لفظ "خودی" ہے۔ اقبال سے پہلے "خودی" کا لفظ نہایت مکروہ تصور کیا جاتا تھا۔ معرفت الٰہی حاصل کرنے کے لئے ضروری تھا کہ انسان اپنے کو بالکل مٹا دے تاآنکہ وہ قطرہ بن کر حقیقت الحقائق کے دریا میں گم ہو جائے۔ خودی پر اقبال نے بہت کچھ لکھا ہے اور اس پر دوسروں کی تشریح بھی بہت کچھ آچکی ہے۔ موضوع سخن کے اعتبار سے یہاں صرف اتنا عرض کر دینا کافی ہے کہ اس خالص معاملے سے اقبال کا منشاء "وحدت الوجود" اور رہبانیت کے عقیدوں کی جڑ پر ضرب کاری لگانا تھا۔ اقبال کے کلام کے مطالعہ سے میں یہ سمجھا ہوں کہ اس کا منشاء یہ تھا کہ "وحدت الوجود" کا عقیدہ غلط اور بے بنیاد ہے اور مشہورات بے اصل ہے .... اور اسلام کی تعلیم کے منافی ہے۔ اور جب انسان اپنی ہستی کو ہستی الٰہی میں گم کر دینے کا آرزومند ہوتا ہے تو اس سے خانقاہی اور رہبانیت پیدا ہوتی ہے۔ ہندوستان کی تاریخ سامنے ہے۔ جب بدھ مذہب یہاں بہت ترقی کر گیا تو سوامی شنکر آچاریہ "ویدانت فلسفہ" لے کر اٹھے۔ بدھوں کے منادر گروا دئے گئے اور مٹھ قائم کئے۔ یہ مٹھ دو قسم

کے تھے۔ ایک تو "نیشٹک" جہاں کا گرو غیر شادی شدہ ہوتا تھا دوسرے
"گرہست" یعنی جہاں کا گرو شادی بھی کر سکتا تھا۔ موخر الذکر بہت
کم مقبول تھے۔ ان مٹھوں میں کسی نہ کسی دیوتا یا دیوی کی پوجا ہوتی
تھی۔ کہیں پاربتی اور کہیں شیوجی اور کہیں کسی اور کی اور اسی لحاظ سے اُن
کے لباس تھے۔ سب گرو اسمبتر پہنتے تھے اور پاربتی جی کے پجاری کان
میں زیور بھی رکھتے تھے۔ گرو کا کام چیلوں کی روحانی تربیت تھا۔ وہ
یا تو اپنا جانشین نامزد کر دیتے تھے یا اگر ایسا نہیں کیا تو چیلے اپنوں میں
سے کسی کا انتخاب کر لیتے تھے۔ سوامی شنکر اچاریہ نے تمام ہندوستان
میں اس قسم کے مٹھ بنوادئے چونکہ گوتم بدھ واجب الوجود کے بارے میں
نہ ہاں کہتے تھے اور نہ نا۔ اور ویدانت فلسفہ کی تعلیم یہ تھی کہ بجز خدا کے
اور کسی کا وجود ہی نہیں ہے۔ اس لئے معرکہ صاف اور کھلا ہوا تھا۔ مسلمانوں
میں جو خانقاہیں قائم ہوئیں اُن میں قریب قریب یہی طریقہ کارفرما تھا۔
پیر خانقاہ مٹھ کے گرو کی طرح دنیا اور دنیا کے آلام سے کوئی مطلب نہیں
رکھتے تھے۔ اُن کی غرض صرف ترکِ دنیا اور حصولِ معرفتِ الٰہی تھی اور عام طور
پر "وحدت الوجود" عقاید و خیالات کا منتہیٰ تھا۔ اقبال نے کہا کہ
انسان کے روحانی سفر کی اول منزل اس کا خود وجود اس مادی دنیا کا
وجود ہے جب تک وہ اپنی معرفت حاصل نہ کرے حیات و کائنات کے فلسفہ
کو سمجھ ہی نہیں سکتا اور کارگاہ ہستی میں ناکارہ محض ہو کر رہ جائے گا۔
ازل سے انسان حیات و کائنات کو سمجھنے اور اس کی گتھی کو سلجھانے میں لگا
ہوا ہے کہ وہ کیا ہے اور یہ دنیا جہاں خوبصورت و دل لبھانے والے مناظر،
اس کو آرام و راحت پہنچانے والے سامان مادی کیا ہیں اور کیا اس عالم آب

کل کا کوئی خالق ہے۔ کوئی ایسی ہستی ہے جس نے اُسے بنایا ہے اور وہ اسے بگاڑ سکتا ہے۔ وہ اس پر کار فرما ہے۔ اور اس میں قادر مطلق کی صفات ہیں۔ دنیا نے عہد بہ عہد اور عصر بہ عصر ان معاملات میں بڑی ٹھوکریں کھائیں۔ اور بڑی بڑی بحثوں کے دروازے کھلے۔ مذہب فلسفہ، سائنس اور عقل انسانی نے مختلف النوع عقائد و تخیلات قائم کئے کسی نے خدا کا، کسی نے روح کا کسی نے مادہ کا انکار کیا۔ آج بھی وہ گروہ موجود ہیں اور ہمیشہ سے رہے ہیں۔ آج بھی دنیا دو حصوں میں بٹی ہوئی ہے۔ ایک وہ جو شدت سے وجود باری کا انکار کرتے ہیں اور دوسرے وہ جو اسے حقیقۃ الخالق مانتے ہیں۔ جو لوگ خدا کے وجود کو مانتے ہیں وہ مذہبوں میں تقسیم ہیں اور ہر مذہب کا الگ عقیدہ ہے اور کچھ ایسے بھی ہیں جو خدا کو مانتے ہیں لیکن کسی ایک مذہب سے تعلق نہیں رکھتے ہیں۔ عیسائی مذہب خدا کے ساتھ حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور روح القدس (حضرت جبریل علیہ السلام جن کو ناموس اکبر بھی اس لیے کہا جاتا ہے کہ وہ اللہ کا فرمان یعنی وحی اللہ کی طرف سے پیغمبروں کے پاس لاتے تھے) کو بھی خدائی میں شریک کرتے ہیں اور اسی کو عقیدہ تثلیث کہا جاتا ہے۔ سوامی شنکر آچاریہ جو ویدانیت فلسفہ کے خاص مبلغ ہیں۔ مادہ اور روح کے وجود کو تسلیم نہیں کرتے ہیں۔ اور صرف خدا کو مانتے ہیں۔ مادہ کو وہ قریب نظر یا قریب خیال تصور کرتے ہیں۔ برکلے فلاسفر نے بھی مادہ کے وجود سے انکار کیا ہے۔ سوامی وویکانند جو ویدانت فلسفہ کے آخری عظیم مبلغ تھے جب کسی کو خط لکھتے تھے تو ان الفاظ میں خطاب کرتے تھے۔ MY SELF IN

THE GARB OF M.R. یعنی میں خود بہ لباس فلاں ۔ آریہ سماجی خدا، روح، اور مادہ تینوں کے وجود کے قایل ہیں ۔ لیکن وہ تینوں کو ازلی مانتے ہیں ۔

اس الجھن کو دور کرنے کے لیے اسلام کا ایک واضح اور روشن نظریہ ہے ۔ جس سے اتفاق یا اختلاف کرنے کا ہر شخص کو حق ہے لیکن اس میں کسی قسم کا کوئی ابہام نہیں ہے ۔ اسلام تعلیم دیتا ہے کہ خدا روح اور مادہ تینوں کا وجود ہے لیکن خدا روح اور مادہ کا خالق ہے اور صرف خداوند کریم ازلی ہے وہ غیر محض ہے اور اس کی صفات غیر لامتناہی ہیں ۔ قرآن پاک جابجا اللہ تعالیٰ کی صفتِ تخلیق پر زور دیتا ہے اور جابجا اس کو زور دار الفاظ میں بیان کیا ہے ۔ یہ وہ چیز ہے جس کی گرد کو انسان اپنی تمام علمی ترقیوں کے باوجود ابھی تک نہیں پا سکا ۔ اب یہ طے ہو چکا ہے کہ ایجاد INVENTION ابھی تک کوئی نہیں ہوئی صرف دریافت (DISCOVERY) ہوئی ہے ۔ ڈے کارٹیس (مشہور فلاسفر) نے اپنی دلیل کا آغاز اس نظریہ پر کیا کہ اس نے کہا کہ آیئے ہر چیز سے انکار کریں اور جو ثابت ہو اسی کو مانیں اس نے کہا کہ ایک شے یقینی ہے یعنی یہ کہ میں ہوں تب یہاں سے وہ آگے چلا اور اس نے کہا کہ میں اس کائنات کے اندر ایک مخلوق بھی نہیں بنا سکتا ۔ لہٰذا اس کا ضرور کوئی خالق ہے اسی کو اقبال نے اس مصرعے میں بیان کیا ہے ؎

ہم ز خدا خودی طلب ہم ز خودی خدا طلب

بعض دانش وروں کو اس مصرعہ کے مفہوم میں تسامح ہو گیا

اور خواہ مخواہ اسے کھینچ تان کر "وحدۃ الوجود" کے ڈانڈوں سے ملا دیا حالانکہ بات صاف یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ سے معرفت طلب کرو کیونکہ بلا توفیق الٰہی کے کچھ حاصل نہیں ہو سکتا اور معرفت نفس کی معرفت الٰہی کے کمالات پیدا کرو۔ اس سے زیادہ واضح حسب ذیل۔

من از بود بخود خود خموشیم
اگر گویم کہ ہستم خود پرستم
ولیکن این نوائے سادہ کیست
کہ در سینہ می گوید کہ ہستم

یعنی میں خود اس بات پر چپ ہوں کہ میں ہوں یا نہیں ہوں کیونکہ اگر میں کہتا ہوں کہ میں ہوں تو خود پرست قرار دیا جاؤں گا یہ معتقدین وحدۃ الوجود پر طنز ہے کہ وہ اپنے وجود کو تسلیم کرنے ہی کو خود پرستی قرار دیتے ہیں پھر کہتا ہے لیکن یہ نوائے سادہ کس کی ہے کہ کوئی میرے سینے میں کہتا ہے کہ ہاں ہوں۔ یعنی وہی ڈے کارٹیس والی بات یعنی اندر سے ہر شخص کے یہ احساس پکارتا ہے کہ وہ ہے۔ اسلامی عقاید کے مطابق روح احسن تقویم پر تخلیق کی گئی ہے۔ لیکن جب وہ ابتذال کی جانب رجوع ہوتی ہے تو اسفل السافلین کا درجہ اختیار کر لیتی ہے۔ اس کے تزکیہ و تہذیب کے لیے ایمان اور عمل صالح کے طریقے بتلائے گئے ہیں اور عمل صالح میں رفع فساد و قیام خیر کے لیے جہاد بھی شامل ہے۔ اسی لیے یہ بھی لازم کیا گیا ہے کہ وہ صفات الٰہیہ پیدا کرنے کی کوشش کرے اور دنیا سے ہر برائی اور خرابی کو دور کرنے کے لیے خود کو اس

الٰہی بنائے اور حکومت اللہ قائم کرے اور یہ اسی وقت ممکن ہے کہ فرد اور قوم دونوں قوانین الٰہیہ کے پابند ہو جائیں کیونکہ انسانی عقل اس کی رہنمائی سے قاصر ہے۔

اسلام نے رہبانیت اور ترکِ دنیا کی تعلیم نہیں دی۔ اسلام کے پیغمبر علیہ السلام نے ہر شخص پر نکاح کو واجب کیا اور قرآن نے جہاں نماز جمعہ کے لئے اذان سن کر نماز کے لئے دوڑنے کا حکم دیا۔ وہیں یہ بھی کہا کہ جب نماز سے فراغت حاصل کر لو تو نجات کے لئے زمین پر پھیل جاؤ۔ لیکن تزکیہ نفس کے قائم رکھنے کے لئے اکل حلال اور صدق مقال کی عملی زنجیریں پیروں میں ڈال دیں اور ہر وقت ذکر اللہ کا شغل قائم رکھ کر قلوب کو متحرک کر دیا۔ اس طرح اسلام نے دنیا اور دین کا ایک معجزہ نما امتزاج پیش کیا۔ اکبر الہ آبادی نے کیا خوب کہا ہے۔

قطعہ۔

تم شوق سے کالج میں پھلو پارک میں پھولو
جائز ہے غباروں میں اڑو چرخ پہ جھولو
پر ایک سخن بندۂ عاجز کا رہے یاد
اللہ کو اور اپنی حقیقت کو نہ بھولو

اسلام کی اس کھلی ہوئی غیر ابہام پذیر تعلیم کے باوجود اسلام کا اثر و اقتدار جب دور دراز ملکوں تک پھیلا تو اس پر عجمی تصورات کی چھائیاں پڑنے لگیں۔ حکومتوں کے زوال اور طاقت کے انحطاط نے جہاد کا دروازہ بند کر دیا اور فقط اللہ ہو اللہ ہو باقی رہ گیا۔ انہی عجمی تصورات میں ایک مسئلہ وحدۃ الوجود کا تھا جو اسلام میں داخل ہو گیا اور رفتہ

رفتہ چھا گیا۔ اب جس کو دیکھو اسی راگ کو الاپ رہا ہے۔ مرزا غالب دنیا کے عظیم شعراء میں تھے لیکن فلسفہ اور تصوف میں اُن کا دخل معرضِ بحث ہے۔ لیکن یہ سیلاب ایسا عام ہو چکا تھا کہ اس کی زد میں وہ بھی آگئے اور کہا ؎

قطرہ اپنا بھی حقیقت میں ہے دریا لیکن
ہم کو منظور تنک ظرفیٔ منصور نہیں

مرزا ایک ذہین انسان تھے۔ انھوں نے اتباعِ عام تو کر دیا لیکن عقل پر زور دیا تو شک میں پڑ گئے۔ فرماتے ہیں۔ قطعہ۔

جبکہ تجھ بن نہیں کوئی موجود — پھر یہ ہنگامہ اے خدا کیا ہے
یہ پری چہرہ لوگ کیسے ہیں — غمزہ و عشوہ و ادا کیا ہے

اقبال نے اس پھیلے ہوئے عقیدے پر بھرپور وار کرنے کا ارادہ کیا۔ اور سوچ سمجھ کر شاعرانہ شوخی اور بلاغت کے ساتھ ایک لفظ اپنے کل بیان و کلام کا ایجاد کیا جس سے ایوانِ تصوف میں زلزلہ آ گیا۔ گویا کہ ایک بم تھا جو پھٹا جسے بہروں نے بھی سنا اور سونے والوں نے بھی — وہ تھا لفظ "خودی" —— خودی کا لفظ عام طور پر غرور اور شخصی امتیاز بالائے امتیاز کے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔ اقبال کا نہ یہ مطلب تھا اور نہ یہ مطلب نکالا گیا لیکن اس لفظ نے خیالات کی دھارا بدل دی اور جو مفہوم وہ ظاہر کرنا چاہتے تھے اس کے لئے دماغ تیار ہو گئے۔ فلسفۂ خودی پر بہت کچھ لکھا گیا ہے لیکن اسے تصوف، ادب اور شاعری کی اینچ میں منطق اور غیر عام فہم الفاظ میں ایسا الجھا دیا گیا ہے کہ اچھے پڑھے لکھے لوگوں کی فہم کی رسائی وہاں تک نہیں ہوتی میں نے اسے عام فہم اور سادہ الفاظ میں بیان کرنے کی

کوشش کی ہے۔ اقبال کا پیام خالص اسلامی تعلیم ہے۔ خودی کے لفظ کی ایجاد نے ان کے کلام کو سمجھنے اور اس کے ادبی نصب العین کو واضح کرنے میں بڑی امداد کی ہے۔ وہ کیسی زبردست دلیل دیتا ہے ؎

جہاں پیدا و محتاجِ دلیلے — نمی آید بہ فکرِ جبرئیلے

اور للکارتا ہے ؎

دگر از شنکر و منصور کم گوئے

ایک لفظ خودی سے اقبال کے ادبی نصب العین کا دور تک پتہ لگتا چلا جاتا ہے۔ وہ انسان کے وجود کو تسلیم کرتا ہے اور دونوں کے خالق اللہ رب السموات والارض کے وجود کو تسلیم کرتا ہے اور تینوں عقائد کو ایک رشتے میں پروتا ہے اور اس سے خدا تک پہنچنے کے لئے عالم میں ستیزہ کاری اور اسے قوانینِ الٰہی کے مطابق لانے کے لئے قیام حق و غارت گری باطل کو لازمۂ حیات قرار دیتا ہے اور اسی سے جہاد فی سبیل اللہ، استقامت با حق، خلافت و نیابت انبیا کے فرض کی ادائگی خودداری ——— خودنگاہی خودگری خودشکنی الغرض ہزاروں نتیجے پیدا ہوتے ہیں۔ اور وہ سب کا نغمہ خواں ہے۔ مگر اصل ان کی خودی ہے۔ وہ فقر و استغنا عبادت و ریاضت، زہد و تقویٰ اشک سحرگاہی سے وضو کو بھی بڑی اہمیت دیتا ہے۔ مگر اقبال کی رائے میں یہ سب اسی وقت لائق مدح ہیں۔ جب ان کا سلسلہ خودی یعنی معرفت نفس سے ملا ہو۔ اور آشکارا ہو انفرادی طور پر بھی اور اجتماعی طور پر بھی اور عالم پر چھا جائے اس کا نمایاں اور کارگر ہونا حق اور انسانیت کی جیت اور اس کا چھپ جانا یا مغلوب ہو جانا باطل کے عملی دخل کا ثمرہ

ہے۔ خودی یعنی اپنی ہستی سے انکار یا اعراض کے بعد یہ سب قنوطیت باطل پرستی یا باطل سے مغلوبیت ہے۔ اس طرح ایک لفظ خودی نے وہ انقلاب عظیم برپا کر دیا جو فلسفہ کی کئی کتابیں نہ کر سکتی تھیں اور خود آگاہی کو وہ درجہ حاصل ہوا کہ وہ خدا آگاہی کا پیش خیمہ قرار پا گئی۔ مگر وہ خود آگاہی نہیں کہ ہم نہیں ہیں یہ تو خود آگاہی کے منافی ہے بلکہ یہ کہ ہم ہیں اور ہم کو اپنے آپ کو سنوارنا اور فرمان واجب الاذعان کے مطابق ہمیں فطرت اور کائنات پر تصرف کرنا ہے۔ شعر کی رومانی زبان میں اور کبھی گستاخانہ الفاظ کے ساتھ وہ اس مقصد کو واضح کرتا ہے چنانچہ ملاحظہ ہو۔ مکالمہ مابین خدا اور انسان۔ انسان خدا سے کہہ رہا ہے ؎

تو شب آفریدی چراغ آفریدم ۔ سفال آفریدی ایاغ آفریدم
بیاباں و کہسار و زاغ آفریدی ۔ گلستاں و گلزار و باغ آفریدم
من آنم کہ از سنگ آئینہ سازم
من آنم کہ از زہر نوشینہ سازم

یعنی اے خدا تو نے رات بنائی تو میں نے چراغ بنایا تو نے مٹی بنائی اور میں نے ایاغ بنایا تو نے بیاباں و کہسار و زاغ بنائے اور میں نے گلستان گلزار و باغ بنائے میں وہ ہوں جو زہر سے تریاق تیار کرتا ہوں اور میں وہ ہوں کہ پتھر سے آئینہ بناتا ہوں۔ مختصر یہ کہ انسان کا وجود ہے اور حکم الٰہی سے وہ فطرت کی تسخیر کرتا اور اس پر تصرف کرتا ہے۔ میلاد آدم پر لکھتا ہے ؎

نعرہ زد عشق کہ خونیں جگرے پیدا شد
حسن لرزید کہ صاحب نظرے پیدا شد

یعنی جب انسان کی تخلیق ہوئی تو عشق نے نعرہ مارا کہ اب خونیں جگر پیدا ہو گیا اور حسن کانپ گیا کہ صاحبِ نظر آ گیا۔ مطلب یہ کہ انسان کا خود وجود ہے وہ عشق سے مملو ہے اور حسن شناس یعنی خدا شناس ہے۔ اس طرح انسان اور خدا دونوں کی الگ الگ ہستیاں ہیں اور انسان جب نوامیسِ الٰہیہ میں ڈوب جاتا ہے تو اسے خدا آگاہی ملتی ہے۔ مسلم کے عنوان سے جو نظم لکھی ہے اس میں اپنا مقصد صفائی سے واضح کر دیا ہے ؎

ہم نشیں مسلم ہوں میں توحید کا حامل ہوں میں
اس صداقت پر ازل سے شاہد عادل ہوں میں
نبضِ موجودات میں پیدا حرارت اس سے ہے
اور مسلم کے تخیل میں جسارت اس سے ہے
حق نے عالم اس صداقت کے لئے پیدا کیا
اور مجھے اس کی حفاظت کے لئے پیدا کیا
دہر میں غارت گرِ باطل پرستی میں ہوا
حق تو یہ ہے حافظِ ناموسِ ہستی میں ہوا

زندگی کے بارے میں کہتا ہے ؎

تو اسے پیمانۂ امروز و فردا سے نہ ناپ
جاوداں پیہم رواں ہر دم رواں ہے زندگی

یعنی انسان کا وجود قطرہ نہیں ہے کہ دریا میں جا کر گم ہو جائے بلکہ وہ قائم بالذات ہے اور روح انسانی نجات پانے کے بعد برابر ترقی کرتی رہے گی اور یہی ٹھوس اسلامی نظریہ ہے یعنی انسانی روح ابد

الاباد تک زندہ و پائندہ رہ کر ترقی کرتی رہتی ہے اسی کو حافظ نے یوں کہا ہے ؎

ما ندانیم کہ منزل گہ مقصود کجا است
ایں قدر ہست کہ بانگ جرسے می آید

یعنی یہ تو معلوم نہیں کہ ہماری منزل کہاں ہے۔ مطلب یہ کہ درحقیقت کوئی منزل ہے ہی نہیں اور قافلہ کی روانگی کے لئے جرس کی آواز ہر وقت آتی رہتی ہے یعنی روح انسانی برابر اپنے مدارج بلند کرتی جاتی ہے اور چونکہ وہ خدا کبھی نہ بن سکے گی۔ اس لئے ابدالاباد تک ترقی اور سفر کا یہ سلسلہ جاری رہے گا۔ مگر اقبال ایک قدم آگے بڑھ جاتا ہے۔

آشکارا ہے یہ اپنی قوت تسخیر سے
گرچہ اک مٹی کے پیکر میں نہاں ہے زندگی

یعنی خودی میں تسخیر کائنات کی بھی طاقت ہے جس کا مفصل تذکرہ آگے آئے گا۔ اس سے بھی مثبت طور پر اس کا وجود ثابت ہے۔

●

خودی کا تجزیہ

اقبال کا فلسفۂ خودی ایک مربوط منظم قانون ہے جس کے اجزائے ترکیبی حسبِ ذیل قرار دئے جا سکتے ہیں یا جو خود بخود واضح نمودار ہو سکتے ہیں۔

(۱) روحِ انسانی، مادہ اور خدا، تینوں کا وجود ہے۔ روح و مادہ کا خالق خدا ہے۔ روحِ انسانی لافانی ہے اور ابدالآباد تک ترقی کرتی جائے گی، مگر خدا کبھی نہ بن سکے گی۔ انسان کے اپنے اس اعلیٰ منصب کا نام "خودی" ہے۔

(۲) انسان اس کائنات پر تصرف کرنے کے لئے پیدا کیا گیا ہے۔ مگر وہ تصرف نوامیسِ الہٰیہ کے تابع ہونا چاہئے۔ اسی حالت میں وہ اپنے مقصد کو پورا کر سکے گا۔ اس لئے "خودی" کا صرف احساس کافی نہیں ہے، اُسے آشکارہ ہونا چاہئے اور جب وہ اپنے کمالات وصفات کے ساتھ آشکارا ہوگی تو عالمگیر قوت وشوکت اس کے جلو میں ہوگی۔

(۳) انسان کا پہلا کام اپنے وجود کا اقرار اس کی حقیقتوں کا فہم۔ اس کے

اختیارات اور پنہائیوں کا ادراک ہے تاکہ وہ امر بالمعروف نہی عن المنکر سے اس دنیا کو رہنے کے قابل اور اپنے فرائض خلافت و نیابت الٰہی کو پورا کر سکے اس لئے ستیزہ کاری بوجہ احسن بغیر خودی محکم نہیں ہو سکتی۔

(۴) اس کے لئے یہ بھی ضروری ہے کہ انسان عقل کا غلام نہ ہو بلکہ عشق کا مطیع ہو یعنی نوامیس الٰہیہ کا پابند ہو تاکہ اپنے اندر وہ اعلیٰ صفات پیدا کرے جن کی تفصیل طویل ہے اور جنھیں اقبال نے انتہائی دلکش پیرایوں میں کبھی ابہام شاعرانہ کے ساتھ اور کبھی صاف صاف بیان کیا ہے۔ اب خودی پہلوؤں پر چند اشعار ملاحظہ ہوں ؎

تیری خودی سے ہے روشن ترا حریم وجود
حیات کیا ہے؟ اسی کا سرور و ساز و ثبات

قطعہ

نہیں مقام کی خوگر طبیعت آزاد
ہوائے سیر شمال و نسیم پیدا کر
ہزار چشمے تری سنگ راہ سے پھوٹیں
خودی میں ڈوب کر ضرب کلیم پیدا کر

؎

ہو اگر خود نگر و خود گر و خود گیر خودی
یہ بھی ممکن ہے کہ تو موت سے بھی مر نہ سکے

قطعہ

خودی کو جب نظر آتی ہے قاہری اپنی
یہی مقام ہے کہتے ہیں جس کو سلطانی
یہی مقام ہے مومن کی قوتوں کا عیار
اسی مقام سے آدم ہے ظل سبحانی

یہ جبر و قہر نہیں ہے یہ عشق و مستی ہے
کہ جبر و قہر سے ممکن نہیں جہاں بانی

قطعہ

ترا وجود سراپا تجلی افلاک
کہ تو وہاں کے عمارت گروں کی ہے تعمیر
مگر یہ پیکر خاکی خودی سے ہے خالی
فقط نیام ہے تو زرنگار و بے شمشیر

قطعہ

یہ حکمت ملکوتی، یہ علم لاہوتی
حرم کے درد کا درماں نہیں تو کچھ بھی نہیں
یہ ذکر نیم شبی، یہ مراقبے یہ سرور
تری خودی کے نگہباں نہیں تو کچھ بھی نہیں

قطعہ

وحدت کی حفاظت نہیں بے قوت بازو
آتی نہیں کچھ کام یہاں عقل خداداد
اے مرد خدا تجھ کو وہ قوت نہیں حاصل
جا بیٹھ کسی غار میں اللہ کو کر یاد
مسکینی و محرومی و نومیدیٔ جاوید
جن کا یہ تصوف ہو وہ اسلام کرے ایجاد

قطعہ

خودی کی پرورش و تربیت پہ ہے موقوف
کہ مشت خاک میں پیدا ہو آتش ہمہ سوز

یہی ہے سرِّ کلیمی ہر اک زمانے میں
ہوائے دشت و شعیب و شبانیٔ شب و روز

قطعہ

خودی کی موت سے مغرب کا اندروں بے نور
خودی کی موت سے مشرق ہے مبتلائے جذام
خودی کی موت سے روحِ عرب ہے بے تب و تاب
بدن عراق و عجم کا ہے بے عروق و عظام
خودی کی موت سے پیرِ حرم ہوا مجبور
کہ بیچ کھائے مسلماں کا جامۂ احرام

قطعہ

خودی کی جلوتوں میں مصطفائی
خودی کی خلوتوں میں کبریائی
زمین و آسمان و کرسی و عرش
خودی کی زد میں ہے ساری خدائی

مندرجہ بالا اشعار سے بخوبی سمجھ میں آسکتا ہے کہ "خودی" سے اقبال کیا مراد لیتا ہے اور اس کے مدارج و لوازمات کیا ہیں۔

حرم اور فرنگ

میں پہلے عرض کر چکا ہوں کہ اقبال دو محاذوں پر جنگ کرنے کے

نے میدان میں کودا تھا۔ ایک تو رہبانیت تاب تصوف اور دوسرے عجز بے روگی۔ اور وہ خود ایک مثبت فلسفۂ زندگی بھی رکھتا تھا۔ حیات و کائنات کی تشریح کے لئے اس کا نظام فکر جامع تھا چونکہ شاعری کے ذریعہ اس نے اپنا پیغام نشر کرنے کا ارادہ کیا اس نے ادب میں انقلاب پیدا کرنا ضروری تھا۔ ادب میں الفاظ کی بڑی قیمت ہے وہ اصطلاح بن کر دھیرے دھیرے دل و دماغ پر قبضہ کر لیتے ہیں اور ان سے بچنا دشوار ہوتا ہے۔ اقبال نے اسکے لئے ایک نئی لغت ایجاد کی اور وہ ایسی جاذب ہے کہ دل و دماغ پر قبضہ کر لیتی ہے اور کہا جا سکتا ہے کہ آج اقبال اس معرکہ میں اس حد تک کامیاب ہے کہ پرانے دواوین اور ادب پارے اور ان کی مرتبہ اصطلاحیں مع ان معانی کے جو قلب و دماغ پر قبضہ کر چکی تھیں گوشۂ طاق نسیاں ہو چکی ہیں۔ ان نو ایجاد الفاظ میں یہ الفاظ "حرم و فرنگ" ہیں جو اقبال نے خاص اصطلاح اور معانی میں استعمال کئے ہیں۔ حرم سے اقبال کل اثاثۂ فکر مراد لیتا ہے جو اسلامی تعلیمات کا پیش منظر ہے۔ وہ کبھی کبھی اسے حجاز بھی کہتا ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ دونوں الفاظ ایسے دلکش ہیں کہ جو بات ان کے نام پر کہی جائیگی وہ دلوں پر اثر کئے بغیر نہیں رہ سکتی ۔

جذب حرم سے ہے فروغ انجمن حجاز کو
اس کا مقام اور ہے اس کا نظام اور ہے

زائرین کعبہ سے اقبال یہ پوچھے کوئی
کیا حرم کا تحفہ زمزم کے سوا کچھ بھی نہیں

ربط و ضبط ملت بیضا ہے مشرق کی نجات

ایشیا والے ہیں اس نکتے سے اب تک بے خبر

اقبال نے حرم کو اس طرح پیش کیا ہے کہ اس لفظ کے زبان پر آتے ہی سارا اسلام سامنے آجاتا ہے ۔

ایک ہوں مسلم حرم کی پاسبانی کے لئے
نیل کے ساحل سے لے کر تا بخاکِ کاشغر

خود بدلتے نہیں قرآں کو بدل دیتے ہیں
ہوئے کس درجہ فقیہانِ حرم بے توفیق

یہ حکمتِ ملکوتی یہ علمِ لاہوتی
حرم کے درد کا درماں نہیں تو کچھ بھی نہیں

اسی طرح فرنگ یا مغرب سے وہ پوری تعلیم مراد لیتا ہے جو فلسفۂ مغرب کی رہینِ منت ہے ۔ یہ تعلیمات کچھ زبانی و تحریری ہیں اور کچھ عملی ۔

؎ تری حریف ہے یارب سیاستِ افرنگ
مگر ہیں اس کے پجاری فقط امیر و رئیس
بنایا ایک ہی ابلیس آگ سے تو نے
بنائے خاک سے اس نے دو صد ہزار ابلیس

؎ ڈھونڈ رہا ہے فرنگ عیشِ جہاں کا دوام
وائے تمنائے خام وائے تمنائے خام

؎ پیرِ میخانہ یہ کہتا ہے کہ ایوانِ فرنگ
سست بنیاد بھی ہے آئینہ دیوار بھی ہے

مغرب میں بہت روشنئ علم و ہنر ہے
حق یہ ہے کہ بے چشمۂ حیواں ہے یہ ظلمات

ظاہر میں تجارت ہے حقیقت میں جوا ہے
سود ایک کا لاکھوں کے لیے مرگِ مفاجات
بے کاری و عریانی و مے خواری و افلاس
کیا کم ہیں فرنگی مدنیت کے فتوحات
یہ علم، یہ حکمت، یہ تدبر، یہ حکومت
پیتے ہیں لہو دیتے ہیں تعلیم مساوات
وہ قوم کہ فیضانِ سماوی سے ہو محروم
حد اس کے کمالات کی ہے برق و بخارات
ہے دل کے لیے موت مشینوں کی حکومت
احساسِ مروت کو کچل دیتے ہیں آلات

قطعہ

نظر کو خیرہ کرتی ہے چمک تہذیبِ حاضر کی
یہ صناعی مگر جھوٹے نگوں کی ریزہ کاری ہے
وہ حکمت ناز تھا جس پر خردمندانِ مغرب کو
ہوس کے پنجۂ خونیں میں تیغِ کارزاری ہے
تدبر کی فسوں کاری سے محکم ہو نہیں سکتا
جہاں میں جس تمدن کی بنا سرمایہ داری ہے

قطعہ

کوئی پوچھے حکیمِ یورپ سے
ہند و یوناں ہیں جس کے حلقہ بگوش
کیا یہی ہے معاشرت کا کمال
مرد بے کار و زن تہی آغوش

قطعہ

یاد ایامی کہ بودم در خمستان فرنگ
جام او روشن تر از جام جم و اسکندر است
چشم مست می فروش باده را پروردگار
باده خواران را نگاه ساقی اش پیغمبر است
جلوه او بی کلیم و شعله او بی خلیل
عقل ناپروا متاع عشق را غارتگر است
سے در ہوایش گرمی یک آہ بیتابانہ نیست
رند این میخانہ را یک لغزش مستانہ نیست
سے فرنگی شیشہ گر کے فن سے پتھر ہو گئے پانی
مری اکسیر نے شیشے کو بخشی سختی خارا

اس طرح اقبال نے مغربی تمدن و تہذیب و طرز معاشرت پر بھرپور وار کیا اور طرح طرح سے اس کے نقائص اور اس کی غلطیاں و غلط کاریاں اور کج فہمیاں واضح کیں اپنے فرزند جاوید کو لندن سے جو خط بھیجا اس میں نصیحت کی ہے کہ :

اٹھا نہ شیشہ گرانِ فرنگ کے احساں
سفالِ ہند سے مینا و جام پیدا کر

اقبال خود فلسفۂ قدیم و جدید کا ایک بڑا عالم تھا۔ وہ مغرب کے طرز تمدن، طرز معاشرت، طرز زندگی الغرض کل فلسفۂ مغرب کو "فرنگ" کا نام دیتا ہے۔ اس نے اس کا بنظر غائر مطالعہ کیا ہے کتابیں پڑھی ہیں اور خود سفر کرکے اپنی آنکھوں سے بھی اس کے اثرات دیکھے ہیں۔ اس کو اپنے علم فلسفہ پر ناز ہے چنانچہ وہ فلسفی زدہ ۔۔

سید زادہ کے نام مکتوب میں تعلّی کے طور پر نہیں اظہارِ حقیقت کے طور پر کہتا ہے ؎

میں اصل کا خاص سومناتی — آبا مرے لاتی و مناتی
تو سید ہاشمی کی اولاد — میری کفِ خاک برہمن زاد
ہے فلسفہ مرے آب و گل میں — پوشیدہ ہے ریشہ ہائے دل میں

اس علم اور واقفیت کی بنا پر وہ مغرب کے فلسفۂ حیات کو جسے وہ افرنگ کا نام دیتا ہے ناقص اور لائقِ رد سمجھتا ہے اور مشرق کی تعلیم کو جس کا آخری لفظ اسلام اور اسلامی تعلیمات ہیں صحیح برحق اور اور انسان کو اپنا صحیح مقام حاصل کرنے کے لئے ضروری مانتا ہے لیکن اس کی فریاد یہ ہے کہ مشرق یعنی اسلام خانقاہوں اور ترکِ خودی میں جا کر گم ہو گیا ہے اور مغرب اپنی تمام خام کاریوں اور باطل پرستیوں کے ساتھ عالم کو مسخر کئے ہوئے ہے۔ اور اسی انقلاب کے لئے اس کا کلام وقف ہے وہ کہتا ہے ؎

بہت دیکھے ہیں میں نے مشرق و مغرب کے میخانے
یہاں ساقی نہیں پیدا وہاں کمیاب ہے صہبا

مکتب

اقبال کی ایک اور اصطلاح ہے مکتب۔ اس سے بھی اس نے ادب میں انقلاب پیدا کیا اور اپنے کلام کے ادبی نصب العین کو مزین کیا۔

مکتب سے اس کی مراد علمی اور روحانی دونوں قسم کی تعلیم گاہیں ہیں اور دونوں قسم کے مراکز ہیں۔ وہ اس زوال کا مرثیہ خواں ہے جو علم دین اور تصوف دونوں میں آگیا ہے۔ وہ اپنا پیغام مکتب و خانقاہ دونوں کو سناتا ہے اور اس کے رموز و نکات کو اجاگر کرتا ہے۔ مکتب جیسے جامع الفاظ سے اقبال نے ادبی نصب العین میں تغیر پیدا کرنے میں بڑا کام لیا ہے اور ذہن اور مزاج کی صحیح تربیت دی ہے ؎

اے پیر حرم رسم و رہِ خانقہی چھوڑ
مقصود سمجھ میری نوائے سحری کا

؎ اللہ رکھے تیرے جوانوں کو سلامت
دے ان کو سبق خود شکنی خود نگری کا
تو ان کو سکھا خارہ شگافی کے طریقے
مغرب نے سکھایا انہیں فن شیشہ گری کا

قطعہ

اقبال یہاں نام نہ لے علم خودی کا
موزوں نہیں مکتب کے لئے ایسے مقالات
بہتر ہے کہ بیچارے ممولوں کی نظر سے
پوشیدہ رہیں باز کے احوال و مقامات

؎ مکتب و میکدہ جز درس نبودن ندہند
بودن آموز کہ ہم باشی و ہم خواہد بود

پروانہ اور جگنو

اقبال نے اپنا پیغام جہاد و عشق دلوں میں اتارنے کے لئے تمام پرانی اصطلاحیں بدل دیں۔ ان میں سب سے زیادہ اہمیت پروانہ کو حاصل ہے۔ کہا گیا ہے کہ۔ قطعہ

در شعر سہ کس پیمبرانند — ہر چند کہ لا نبی بعدی
ابیات و قصیدہ و غزل را — فردوسی و انوری و سعدی

علامہ شبلی نے انوری کی نبوت پر کوئی معجزہ نہ ہونے کی وجہ سے اسے رد کر دیا۔ مگر منکر سعدی آج تک پیدا نہیں ہوا۔ شیخ شیرازی فرماتے ہیں ؎

اے مرغ سحر عشق ز پروانہ بیاموز — کاں سوختہ را جاں شد و آواز نیامد

پروانہ کی عظمت صدیوں سے دل و دماغ پر چھائی ہوئی تھی۔ گلستان سعدی کو جو مقبولیت حاصل ہوئی وہ محتاج بیان نہیں۔ اور یہی حال ہر شاعر اور ادیب کا رہا ہے۔ کون ہے جو پروانہ کی مدح میں رطب اللسان نہیں ہے۔ اسی طرح ہر گھر میں "پروانہ" عاشق خود سوز کی حیثیت سے ایک بلند مقام پر فائز رہا ہے۔ مگر اقبال علم جہاد لے کر اس وقت میدان میں اترا جب ایک طرف شمع مغرب کے گرد طواف ہو رہا ہے اور دوسری طرف شنکر آچاریہ کی رہبانیت کارفرما ہے۔ اقبال جو خودی کی تعلیم دیتا ہے اس کا پیغام یہ

ہے کہ اسلام ایک مکمل نظام حیات ہے۔ اسے کسی دریوزہ گری کی ضرورت نہیں۔ اس نے تشبیہ بدل دی۔ پروانہ کو "دریوزہ گر آتشِ بیگانہ" قرار دیا اور کل تک جو شہید اعظم تھا آج اس کی لاش بے گور و کفن پڑی ہے کوئی کندھا دینے والا نہیں اور جگنو کے اندر چونکہ خود روشنی ہے اس لئے جگنو کا مرتبہ اونچا ہے۔ ان استعاروں نے اقبال کے فلسفہ خودی کو جامعیت عطا کی اور اسے مسلسل اور مدون قرار دیا۔ اسی طرح وہ ہر اس چیز کو حقارت کی نگاہ سے دیکھتا ہے جو دوسرے سے اکتساب کرے۔ چنانچہ چاند کو بھی چونکہ سورج روشنی دیتا ہے۔ اس لئے اقبال کی نگاہ میں وہ قابلِ عزت نہیں۔ چاند کے حسن و زیبائی پر تمام دنیا کے ادب میں کتنا لکھا گیا ہے لیکن یہ اقبال ہی تھا جس نے چاند کے اس نقص کو واضح کیا۔ اس کا تو ایک موضوع ہے ایک مضمون ہے۔ اور اسی کے لئے اس پر وہ اپنی پوری قوت صرف کرتا ہے چنانچہ چاند کو مخاطب کر کے جو نظم لکھی ہے اس کے چند اشعار ملاحظہ ہوں ؎

آہ میں جلتا ہوں سوزِ اشتیاقِ دید سے
تو سراپا سوز داغِ منتِ خورشید سے
گرچہ میں ظلمت سراپا ہوں سراپا نور تو
سینکڑوں منزل ہے ذوقِ آگہی سے دور تو
جو مری ہستی کا مقصد ہے مجھے معلوم ہے
یہ چمک وہ ہے جبیں جس سے تری محروم ہے

ملاحظہ کیجئے کہ کس پرشکوہ الفاظ میں وہ جگنو کی تعریف کرتا ہے۔

وہ جگنو جو اب تک ناقابلِ توجہ تھا سہ

جگنو کی روشنی ہے کاشانۂ چمن میں
یا شمع جل رہی ہے پھولوں کی انجمن میں
آیا ہے آسماں سے اڑ کر کوئی ستارہ
یا جان پڑ گئی ہے مہتاب کی کرن میں
یا شب کی سلطنت میں دن کا سفیر آیا
غربت میں آکے چمکا گمنام تھا وطن میں
تکمہ کوئی گرا ہے مہتاب کی قبا کا
ذرہ ہے یا نمایاں سورج کے پیرہن کا

اور پھر پروانہ اور جگنو کا مقابلہ کر کے اپنا مقصد واضح کرتا ہے سہ

پروانہ اک پتنگا جگنو بھی اک پتنگا
وہ روشنی کا طالب وہ روشنی سراپا

دوسری جگہ جگنو کی آواز سے کہلوایا ہے کہ:

لباسِ نور میں مستور ہوں میں   پتنگوں کے جہاں کا طور ہوں میں

اور پھر کہتا ہے سہ

اللہ کا صد شکر کہ پروانہ نہیں میں   دریوزہ گرِ آتشِ بیگانہ نہیں میں

اور پھر پیغام دیتا ہے سہ

کرمکِ ناداں طوافِ شمع سے آزاد ہو
اپنی فطرت کے تجلی زار میں آباد ہو

اسی طرح تہذیب حاضر کے عنوان سے اس کی چمک دمک بیان کرنے کے بعد لکھتا ہے

فروغِ شمعِ نو سے بزمِ مسلم جگمگا اٹھی

مگر کہتی ہے پروانوں سے میری کہنہ ادراکی
تو اے پروانہ! ایں گرمی ز شمع محفلے داری
چو من در آتشِ خود سوز اگر سوزِ دلے داری

○

بلبل اور شاہین

پرندوں میں سب سے زیادہ مقبول بلبل ہے۔ ادب و شعر میں بلبل کا مقام قابلِ رشک ہے۔ بلبل گل پر عاشق ہے اور نغمہ خوانی و نوحہ و فغاں اس کا شعار ہے۔ محمد حسین آزاد لکھتے ہیں کہ انھوں نے خود بلبل کو ایران میں تمام شب غزل پڑھتے سنا ہے اور وہ قافیہ پر تان ہر شعر کی توڑتا ہے۔ بلبل کا ترنم اور اس کا عشق تب و تاب زندگی اور اصل محبت کے اظہار کے لیے بہترین تخئیل ہے مگر اقبال نے "نارِ خودی" اور "نورِ خودی" کے ظہور کے لیے جو ادبی نصب العین مقرر کیا تھا اس کے لیے بلبل کسی طرح مناسب نہیں ہے۔ بلبل میں ایک فرسودہ رنگِ صبر ہے اس میں مثبت فعل کوئی نہیں اور نہ اس کے سامنے بجز نغمہ خوانی کوئی عمل ہے۔ وہ گلشن در آشیانہ تلاش کرتا ہے اور شب و روز محبتِ گل میں نغمہ خواں ہے۔ اقبال کے مطمحِ نظر یہ صفات محمود نہیں یا ان کے فلسفۂ جہاد کے فریم میں نہیں موزوں ہوتی ہیں۔ وہ کچھ اور چیز چاہتا ہے جس کے لیے شاہین کا انتخاب کیا۔ شاہین صحرا نورد ہے وہ آشیانہ نہیں بناتا یعنی اس کا مسلک فقرِ غیور ہے۔ پرندوں میں سب سے زیادہ

تیز پرواز ہے۔ خود شکار کرتا ہے۔ اور وہی کھاتا ہے۔ دوسرے کا مارا ہوا شکار نہیں کھاتا اور نہ مردہ شکار کھاتا ہے۔ صحرا اور دریا اس کے بال و پر کے نیچے ہیں۔ خود اپنی دنیا تعمیر کرتا ہے۔ آزاد ہے۔ اور قوت و شوکت رکھتا ہے چنانچہ وہ ایک نظم "ماہی و شاہین" کے عنوان سے لکھتا ہے۔ اس میں ماہی بچہ و شاہین بچہ کا ایک مکالمہ ہے۔ ماہی بچہ کہتا ہے کہ اس دریا میں بڑے بڑے خوفناک مگرمچھ ہیں۔ مگر کیا کروں کہ اس سے باہر نکلنا ممکن نہیں کیونکہ دریا کی لہریں ؎

بیروں نتواں رفت ز موج ہمہ گیرش
بالائے سر ماست تہ پاست ہمہ جاست

یعنی اس کی ہمہ گیر موجوں سے باہر نکلنا ممکن نہیں ہے۔ کیونکہ یہ ہمارے سر پر ہمارے پیر کے نیچے ہر جگہ موجود ہے۔ اتنا کہہ کر ماہی بچہ کا چہرہ سوز غم سے سرخ ہو گیا۔ شاہین بچہ ہنسا اور ساحل سے ہوا میں اڑ گیا۔ اور وہاں سے پکارا کہ میں شاہین ہوں۔ دریا ہو کہ صحرا میرے بال و پر کے نیچے ہے۔ اس مکالمہ کے بعد اقبال پیغام دیتا ہے ؎

بگذر ز سر آب و بہ پہنائے ہوا ساز — ایں نکتہ نہ بیند مگر آں دیدہ کہ بیناست

یعنی پانی کی لہروں سے نکلو اور ہوا میں پرواز کرو۔ اس نکتہ کو کوئی نہیں دیکھتا۔ سوائے اس کے کہ جس کو دیدۂ بینا نصیب ہوئی ہے ہم یہ سمجھتے ہیں جنھوں نے تصادم ذوالنفس کا منظر دیکھا ہے جو عصر حاضر کی تہذیب کے بندھنوں کو توڑ کر آزادی کی فضا میں سانس لینا چاہتے تھے اور اس کے لئے کوشش بھی کی ہے مگر آخر کار ماہی بچہ کی طرح اسی وکالت اسی ملازمت اور اسی آہن نو کی زنجیر میں پھر واپس

آگئے ہیں اور عمل نہیں پاتے۔ جب ۱۹۲۰ء میں تحریکِ خلافت کا ظہور ہوا اور کثرت سے نوجوان گریجویٹوں نے تعلیم گاہوں کو بائی کاٹ کیا تو علی گڑھ اس کا کاروان سالار تھا۔ بہت سے میدان میں نکلے مگر کتنے ثابت قدم رہے۔ اقبال نے علی گڑھ کے طلبا کو ایک پیام دیا ہے ؂

عرب از سرشکِ خونم ہمہ لالہ زار بادا
عجم رمیدہ بو را نفسم بہار بادا
نوجوانِ خام سوزے سخنم تمام سوزے
غزلے کہ می سرایم بہ تو سازگار بادا

میں اکثر ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب سے کہا کرتا تھا کہ ہم سب خام سوزوں میں صرف ایک آپ تمام سوز نکلے۔ میرے ایک دوست محمد بخاری بی۔ اے۔ آنرز تھے وہ مجھے ۱۹۲۲ء میں دلی میں ملے اور بہت متفکر بہت مغموم ہوئے کہ میں وکالت پڑھنے جا رہا ہوں۔ انھوں نے مجھے مشورہ دیا کہ میں دس روپیہ میں ایک خوانچہ خریدلوں اور گلے میں لٹکا کر بیچوں عرصے تک یہ محترم رفیق کانپور میں چمڑے کی تجارت کے چکر میں رہے اور آخر کار ہم انہی بچوں کی محفل میں شریک ہو گئے۔ کتنی حقیقت ہے کلام اقبال میں۔ میں نے طرح کل باتیں ایک مضمون میں سمو دیں۔ ہم لوگوں نے اقبال کو پڑھا۔ اسے سمجھنے کی کوشش کی۔ میں تو ایک عرصہ تک اُن کی صحبت میں بیٹھا اور اُن کی زبان سے اُن کے کلام کی شرح سنی مگر موجودہ تمدن کے بحرِ ناپیدا کنار کی موجوں نے ہمیں اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ ہم کلامِ اقبال کی روح پر عمل نہ کر سکے اور خود اقبال نے اس کی پیشن گوئی کر دی تھی ؂

عصر من دانندۂ اسرار نیست
یوسف من بہر ایں بازار نیست
اے بسا شاعر کہ بعد از مرگ زاد
سر مرگ دیدگی بر ما کشاد
اور طور من سوزد کہ می آید کلیم

لیکن بلبل کا زمزمہ اور ماہی بچہ کا سوز دروں ختم ہونے کو ہے۔ شاہین بچہ عالم وجود میں آنیوالا ہے۔

دلیل صبح روشن ہے ستاروں کی تنک تابی
افق سے آفتاب ابھر آگیا دورِ گراں خوابی

اب آیئے پھر شاہین کی اصطلاح کی طرف ایک لمحہ کے لیے واپس ہوں اور کلام اقبال سے اس کا مفہوم واضح کریں۔ جاوید کو نصیحت کرتے ہوئے اقبال نغمہ خواں ہے ؎

ہمت ہو اگر تو ڈھونڈ وہ فقر — جس فقر کی اصل ہے حجازی
اس فقر سے آدمی میں پیدا — اللہ کی شانِ بے نیازی
کنجشک و حمام کیلئے موت — ہے اس کا مقام شاہبازی

اس کے بعد مختلف جگہوں پر اور طرح طرح سے شاہین کی تمثیل سے جو حقائق رونما ہوتے ہیں انھیں واضح کیا ہے۔ حسب ذیل اشعار سے ان کا پتہ خود بخود چل جائے گا ؎

وہ فریب خوردہ شاہیں جو پلا ہو کرگسوں میں
اسے کیا خبر کہ کیا ہے رہ و رسم شاہبازی
خودی کی شوخی و تندی میں کبر و ناز نہیں
جو ناز ہو بھی تو بے لذت نیاز نہیں

نگاہ عشق دل زندہ کی تلاش میں ہے
شکار مردہ سزاوار شاہباز نہیں

سہ فقیران حرم کے ہاتھ اقبال آگیا کیوں کر
میسر میر و سلطاں کو نہیں شاہین کافوری

ہے یاد مجھے نکتۂ سلمان خوش آہنگ
دنیا نہیں مردان جفاکش کے لیے تنگ
چیتے کا جگر چاہیے شاہیں کا تجسس
جی سکتے ہیں بے روشنی دانش و فرہنگ
کر بلبل و طاؤس کی تقلید سے توبہ
بلبل فقط آواز ہے طاؤس فقط رنگ

قطعہ

ترا اندیشہ افلاکی نہیں ہے — تری پرواز لولاکی نہیں ہے
یہ مانا اصل شاہینی ہے تیری — تری آنکھوں میں بیباکی نہیں ہے

قطعہ

ترا جوہر ہے نوری پاک ہے تو
فروغ دیدۂ افلاک ہے تو
ترے صید زبوں افرشتہ و حور
کہ شاہین شہ لولاک ہے تو

قطعہ

الفاظ و معانی میں تفاوت نہیں لیکن
ملا کی اذاں اور مجاہد کی اذاں اور
پرواز ہے دونوں کی اسی ایک فضا میں
کرگس کا جہاں اور ہے شاہیں کا جہاں اور

گل و لالہ

ایک عجیب و غریب اصطلاح "لالہ" ہے۔ لالہ کا پھول صحرا میں کھلتا ہے اور خودرو ہوتا ہے۔ اس لئے منت کشِ باغباں نہیں ہوتا۔ اقبال جو تہذیبِ حاضر کی ظاہری چمک سے مرعوب نہیں ہے بلکہ اسے دل کے لئے موت تصور کرتا ہے اور سادگی و خودداری، فقر و آزادی کو ضمیرِ انسانی کا جوہر بنانے کا خواہشمند ہے۔ شعرائے قدیم کے نزدیک مدحِ گل کا ہم سخن کیسے ہو سکتا تھا۔ وہ جو تعلیم دینا چاہتا ہے۔ وہ "گل" کی تمثیل کے بالکل خلاف ہے۔ پھول باغ میں مسکراتا ہے ہنستا ہے، اور پھر مرجھا جاتا ہے۔ اسے نہ آزادیٔ صحرا میسر ہے نہ میدان کی پہنائیاں۔ "نہ آزادی اور نہ خودداری" اسے توڑ کر لوگ اپنے لباس اور میز کے گلدستوں کی زینت بناتے ہیں۔ چنانچہ گل کے بارے میں ایک جگہ لکھا ہے ؎

نہیں یہ شانِ خودداری چمن سے توڑ کر تجھ کو
کوئی دستار میں رکھ لے کوئی زیبِ گلو کر لے

اپنی اصلیت پر قائم رہنا اور اسی پر مرنا اور مٹنا حاصلِ حیات ہے۔ اسی لئے پورے اسلام کو بھی ایک لفظ "لالہ" کی تشبیہ سے ظاہر کرتا ہے۔

اس طرح گل و بلبل کی کہانی جو صدیوں سے چلی آ رہی تھی۔ اقبال

کے ہاتھوں دفن ہوئی اور اس کی جگہ شاہین اور لالہ نے لے لی اور اس طرح اس نے ادبی نصب العین کو عمل کیا اور اپنا پیام دلوں کی گہرائیوں میں اتار دیا۔

ساحل اور موج

عام طور پر تمام دواوین میں موج سے مراد مصیبت اور بلا ہے اور اس سے بچنا لازم ہے۔ ساحل منزلِ مقصود ہے اور آرام و اطمینان کا مقام ہے مگر مجاہد اقبال کی نگاہ میں ایسا نہیں ہے۔ وہ موج اور دریا کو ساحل پر ترجیح دیتا ہے۔ کیونکہ اس کا فلسفہ عمل ہے اور موج میں حرکت ہے۔ جبکہ ساحل سکون پذیر ہے۔ ایک مثال اسے واضح کرنے کے لئے کافی ہے ؎

ساحل افتادہ گفت ‌ ‌ ‌ گرچہ بسے زیستم
ہیچ نہ معلوم شد ‌ ‌ ‌ آہ کہ من چیستم
موج ز خود رفتۂ ‌ ‌ ‌ تیز خرامید و گفت
ہستم اگر می روم ‌ ‌ ‌ گر نہ روم نیستم

موتی اور شبنم

شبنم ایک قطرۂ آب اور حقیر ہے اور چمکدار موتی لائق تعریف ہے مگر موتی پانی کی بدلی ہوئی اصلیت کا دوسرا نام ہے۔ ابر نیساں

کا قطرہ جب صدف میں جاتا ہے تو وہ درخشندہ موتی بن جاتا ہے اور آج تک سب لوگ اسی تب وتاب کے قصیدہ خواں تھے مگر اقبال اسے اپنی فطرت سے تغیر کے بنا پر لائق اعتنا نہیں سمجھتا اور شبنم کا یہ حال ہے کہ وہ اپنی خودی پر قائم اور اپنی گوہر ذات کی نگراں ہے چنانچہ ایک عجیب نظم میں شبنم کی زبان سے کہتا ہے کہ مجھ سے کہا گیا کہ آسمان سے نیچے اترو اور سمندر میں جاکر موتی بن جاؤ مگر میں نے اس لئے انکار کر دیا کہ میری اصلیت بدل جائے گی۔ چنانچہ میں ایک بوند پانی ہی رہی اور "لالہ پر آکر ٹپکی۔ میں اس شراب کو چکھنا نہیں چاہتی جس سے میں اپنے آپ سے منحرف ہو جاؤں۔

گفتند فرود آئے ز اوج مہ و پرویز
بر خود زن و با بحر پر آشوب در آویز
با موج در انگیز
تابندہ گہر خیز
من عیش ہم آغوشی دریا نخریدم
آں بادہ کہ از خویش رباید نچشیدم
از خود نرمیدم
ز آفاق بریدم
بر لالہ چکیدم

مجموعوں کے نام

اقبال کے "ادبی نصب العین" کا اندازہ ان ناموں سے بھی

گا جو اس نے اپنے مجموعوں کے رکھے ہیں۔ "بانگ درا" "بال جبریل" "ضربِ کلیم" "ارمغانِ حجاز" "پیامِ مشرق" "خضرِ راہ" وغیرہ وغیرہ

خاتمۂ کلام

ابھی اور بہت سے محاورات باقی ہیں۔ کتنی اور اصطلاحیں رہ گئیں جن کا ذکر نہیں آیا۔ نقشِ اول ہے۔ ممکن ہے زمانہ فرصت دے تو بہتر کشد ز اول نقاش نقشِ ثانی کوئی اس سے بہتر چیز پیش کر سکوں پھر بھی مندرجہ بالا مثالوں سے اقبال کے "ادبی نصب العین" کا ایک دھندلا سا خاکہ سامعین کے ذہن میں ضرور آ جائے گا۔ اور اس سے یہ بھی واضح ہو جائے گا کہ حافظ پر اقبال نے کس زاویۂ نگاہ سے اعتراض کیا تھا۔ حافظ کا اقبال معتقد نہ ہو مگر حافظ کے اشعار کو جا بجا نقل کیا گیا ہے۔ اس سے بھی اس کا بدیہی ثبوت ملتا ہے جو میں نے اوپر شروع میں عرض کیا کہ اقبال کا منشاء ان اشعار سے کیا تھا جو اس نے حذف کر دئے۔

اقبال نہ تصوف کا مخالف تھا نہ کشف و کرامات کا۔ وہ ایک مصلح تھا اور دین میں جو فساد کسی طرف سے آگیا تھا اسے مٹانا چاہتا تھا۔ اس کا ہر اعتراض تعمیری ہے کہیں بھی تخریبی نہیں۔ وہ مجدد الف ثانیؒ اور دوسرے اولیائے کرام کا بڑا معترف و معتقد اور بڑے ذوق سے کہتا ہے۔

ولایت، پادشاہی، علم اشیا کی جہاں گیری
یہ سب کیا ہیں فقط اک نکتۂ ایماں کی تفسیریں

اقبال کا "ادبی نصب العین" اسلوبِ الفاظ و معانی و اصطلاحات میں وہ عظیم انقلاب ہے جس کے ذریعے وہ ذہنوں میں انقلاب پیدا کرنا چاہتا تھا۔

اقبال اور اسلام

سرودِ رفتہ باز آید کہ ناید　　نسیمے از حجاز آید کہ ناید
سر آمد روزگارِ ایں فقیرے　　دگر دانائے راز آید کہ ناید

تحریکِ خلافت زوروں پر تھی۔ حکومت سے مکمل بائیکاٹ کا اعلان کیا جا چکا تھا۔ خطابات واپس کر دو۔ اسکولوں اور کالجوں کی تعلیم ترک کر دو۔ کچہریوں میں مقدمات نہ لے جاؤ۔ کسی ادارے سے سرکاری امداد نہ لو۔ الغرض انگریز کی حکومت کے وجود سے انکار کر دو اور جو تکلیف آئے اسے برداشت کرو اور عدم تشدد پر عمل پیرا رہو۔ یہ تھا مہاتما گاندھی کا پیغام، کانگریس کا فیصلہ اور علماءِ ہند کا متفقہ فتویٰ۔ اس لائحہ عمل کا نام عرفِ عام میں ترکِ موالات تھا۔ اور اس کی بنیاد ”استقامت بالحق“ کہی جاتی تھی۔ سارا ہندوستان نعروں سے گونج رہا تھا۔ اور جوش و خروش کا یہ عالم تھا کہ جو لوگ اس تحریک کا ساتھ نہیں دیتے تھے، ان میں سے کسی کی ہمت نہیں تھی کہ پبلک میں منظرِ عام پر آ کر کچھ بول سکیں

وہ خود اپنی نظروں سے گر گئے تھے۔ عمل درآمد کا یہ حال تھا کہ جو لوگ گرفتار ہوتے تھے اور جن پر کچہریوں میں مقدمے چلائے جاتے تھے وہ اپنا بیان دینا یا اپنا نام تک بتلانا۔ گناہ تصور کرتے تھے اور ملزم کے کٹہرے میں کھڑے ہو کر یوں پکارتے تھے "عدالت کو جس کے سامنے میں کھڑا ہوں معلوم ہونا چاہیے کہ میں آپ کے اختیار کو تسلیم نہیں کرتا اور کسی بیان دینے سے انکار کرتا ہوں"۔

میں یونیورسٹی اسکول آف الٰہ آباد میں پڑھ رہا تھا کہ ترک موالات کا اعلان ہوا میں وہاں سے کالج چھوڑ کر نکل آیا کچھ دن مولانا حسرت موہانی کے ساتھ کان پور رہنے کے بعد اخبار "مدینہ" بجنور میں نائب مدیر کی حیثیت سے کام کیا اور غالباً ۱۹۲۲ء میں اخبار "زمیندار" لاہور کا مدیر خصوصی مقرر ہوا۔ مولانا غلام رسول مہر نے بھی شاید اعلان ترک موالات سے قبل ہی بی۔ اے۔ پاس کیا تھا۔ اور وہ میرے ساتھ معاون مدیر تھے اور مرتضیٰ حسین سیکشن بھی ادارے کے ایک رکن تھے۔ حفیظ جالندھری اس وقت دفتر میں کام کرتے تھے۔ اس زمانے کے جوش و خروش کی انتہا پسندی کے دو واقعات ذیل میں درج کئے جاتے ہیں۔ اسی زمانے میں بنارس میں کانگریس کی جانب سے ایک کانفرنس ہوئی جس میں سردار ولبھ بھائی پٹیل بھی تشریف لائے میں خود "زمیندار" کے نمائندے کی حیثیت سے اس کانفرنس میں شریک تھا۔ میں نے سردار پٹیل سے انٹرویو بھی لیا تھا۔ ایک کپتان پولیس نے اخبار "زمیندار" پر عدالت سول جج میں پچاس ہزار روپیہ کا دعویٰ ازالۂ حیثیت عرفی کے تحت کیا تھا۔ اور سوال

تھا کہ مقدمہ لڑا جائے یا نہ لڑا جائے۔ گاندھی جی گرفتار ہو گئے تھے اور پنڈت مدن موہن مالویہ جی تمام ہندوستان کا دورہ کر کے تحریک ترکِ موالات کو ایک نئی شکل دے رہے تھے۔ وہ یہ بتلانے میں مصروف تھے کہ کچہریوں عدالتوں تعلیمی درس گاہوں کا بائیکاٹ ترکِ موالات میں شامل نہیں ہے۔ وہ تحریک ترکِ موالات سے انکار نہیں کرتے تھے مگر وہ اس کی جدید تشریح کرتے تھے اور ایک جداگانہ فلسفہ بیان کرتے تھے۔ اخبار "زمیندار" شدت سے ان کی رد میں لگا ہوا تھا۔ یہ محض اتفاق تھا کہ جس دن میرا اداریہ "مذبوح الطرفین پنڈت مالوی" شائع ہوا اسی دن صفحہ اول پر اقبال کا حسبِ ذیل قطعہ بھی چھپ گیا۔

کتنی خدمت کی ہے خلق اللہ کی	دیکھئے ہوتے ہیں کب سر مالوی
مسلم ناداں کو کیا معلوم ہے	کس خدا کے ہیں پیمبر مالوی
خوب تھا یہ خالصہ جی کا بچن	کب ہے گاندھی کے برابر مالوی
مرد میداں گاندھی ہے درویش تو	اور کونسل کے اسپیکر مالوی

لیکن مالوی جی کی خدمات اور ان کے خلوص و عظمت کا اتنا احترام تھا کہ پختہ سے پختہ کانگریسی اخبارات حتیٰ کہ "بندے ماترم" لاہور بھی ہماری مخالفت کرتا تھا۔ پنڈت مالوی جی بھی بٹالہ آئے تھے اور میرا ارادہ دونوں سے انٹرویو کر کے دونوں کے بیانات کو شائع کرنا تھا۔ افسوس ہے کہ میری یہ آرزو پوری نہیں ہوئی۔ کیونکہ مالوی جی نے انٹرویو میں ایک لمبا بیان کئی صفحات کا لکھانے کے بعد اسے نظرِ ثانی کے لئے واپس لے لیا اور پھر وہ مجھے نہیں ملا۔ غالباً ان کی بے پناہ مشغولیتوں کی نذر

ہو گیا۔ یہ وہی بٹالہ کانفرنس ہے جہاں سے واپسی کے بعد میں نے دیکھا کہ ایک عالیشان مسجد بن کر تیار ہے جس پر کتبے بھی لکھ گئے ہیں اور یہی وہ مسجد ہے جس کے لئے علامہ اقبال نے فرمایا ہے۔ قطعہ

مسجد تو بنا دی شب بھر میں ایماں کی حرارت والوں نے
دل اپنا پرانا پاپی ہے برسوں میں نمازی بن نہ سکا

میں نے سٹرار پٹیل سے انٹرویو کے دوران جب یہ کہہ کر سوال کیا کہ پنڈت مالوی ایسا ایسا کہتے ہیں۔ ان سب کے بارے میں آپ کیا فرماتے ہیں۔ تو انھوں نے کہا کہ نام نکال کر اصولی سوال کیجئے۔ اور نام بتانے پر انھوں نے پنڈت مالوی کے خیالات کی بھرپور تردید کی۔ اور بعد ازاں جب میں نے کپتان پولیس کے مقدمے کے بارے میں پوچھا تو انھوں نے فرمایا کہ "مسٹر زمیندار" جب آپ مالوی پر اس طرح اعتراض کرتے ہیں تو آپ مقدمہ میں جواب دہی نہیں کر سکتے۔" اس سوال کی ضرورت اس لئے پیدا ہوئی تھی کہ ہم لوگ یہ سمجھتے تھے کہ اخبارات کو ترک موالات کے تحت اس کے ہمہ گیر ضوابط سے مستثنیٰ ہونا چاہیئے۔ اس وقت کی پچاس ہزار روپیہ کی زرِ خطیر کو اپنے سر اس حالت میں لاد لینا خلاف مصلحت نظر آیا تھا۔ خصوصاً جبکہ حکومت اخبار بند کرنے پر تلی ہوئی تھی تقریباً ہر ہفتے ہمارے دفتر کی تلاشی ہوتی تھی۔ ہر آدمی پریس۔ آئی۔ ڈی مقرر تھا۔ پرچے ضبط کئے جاتے تھے اور پریس ایکٹ کے ماتحت دس دس ہزار کی ضمانتیں طلب ہوتی تھیں لیکن پٹیل جی کے حکم کے بعد ہوا یہی کہ مقدمہ میں جواب دہی نہیں کی گئی۔ اور پچاس ہزار روپے کی سعہ خرچہ مقدمہ ڈگری ہو گئی جو روزنامہ زمیندار کو ادا کرنی پڑی۔

۵

دوسرا واقعہ اسی دوران کا یہ ہے کہ انجمن حمایت اسلام لاہور کا سالانہ جلسہ ہوا۔ انجمن حمایت اسلام لاہور ہندوستان کی ایک مشہور ترین انجمن تھی۔ اس کی سرپرستی میں ایک عالی شان عربی مدرسہ ایک وسیع یتیم خانہ ایک ہائی اسکول ایک انٹر کالج اور ایک اسلامیہ ڈگری کالج تھے۔ اس کا ایک شعبہ نشر و اشاعت بھی تھا جہاں کتابیں لکھی اور چھاپی جاتی تھیں وہاں کی کتابیں اب بھی یہاں کے مکاتب اسلامیہ کے نصاب میں داخل ہیں اور بڑی کارآمد ہیں۔ انجمن حمایت اسلام نے اپنے تمام اداروں کے لئے حکومت کی امداد بند نہیں کی تھی اور اس لئے اس کا بائیکاٹ تھا۔ چونکہ انجمن مذکور کے کارناموں سے میں بہت متاثر تھا۔ اس لئے میں خود بطور نمائندہ زمیندار رپورٹنگ کے لئے اس میں شریک ہوتا تھا۔ ایک جلسہ کی صدارت مولانا محمد علی ایم۔ اے۔ مفسر قرآن قادیانی صاحب نے کی اور دوسرے جلسہ کی صدارت جب میں موجود نہیں تھا اور ایک دن کے لئے کہیں چلا گیا تھا۔ مولانا محمد علی صاحب شیرانوالہ دروازہ لاہور نے کی مولانا عبید اللہ صاحب سندھی کے شاگرد تھے اور قرآن کی تعلیم دیتے تھے اور خود کما کر یعنی کبھی صابن بنا کر کبھی کتابت کی تصحیح کر کے اپنی گذر اوقات کرتے تھے۔ وہ جمعرات کا پورا دن اور جمعہ کی نماز تک آدھا دن کمانے میں صرف کرتے تھے۔ اور جو مل جاتا تھا۔ اس سے ایک ہفتہ گذارہ کرتے تھے۔ یکہ والوں تانگہ والوں اور جہلا کو ناظرہ قرآن بی۔ اے اور ایم۔ اے کو قرآن کی شرح اور علماء فارغ التحصیل کو ترتیب آیات پڑھانے میں ان کا پورا وقت صرف ہوتا تھا۔ ہر روز صبح بعد نماز فجر قرآن پاک کی تفسیر بیان کرتے تھے۔

۲ر شوال کو الحمد للہ سے شروع کرتے تھے اور ۲۹ ر رمضان کو والناس پر ختم کر دیتے تھے۔ یعنی اگر کوئی شخص پورے سال باقاعدہ نماز فجر ان کے وعظ میں شریک ہو تو پورا قرآن معانی و مطلب شرح کے ساتھ سن لے حق گوئی اور بے باکی کا یہ عالم تھا کہ برابر جلسے میں سی آئی ڈی والے موجود رہتے تھے اور تقریر نوٹ کرتے تھے مگر مولانا پر اس کا کوئی اثر نہ تھا۔ موقع آنے پر انتہائی جرأت کے ساتھ انگریز اور انگریز کی حکومت کے خلاف بیان کرتے تھے اور ایسا بیان کہ دل گرم ہو جاتا تھا۔ ظاہر ہے کہ ایسے درویش صفت عالم باعمل کی شہر میں کتنی عزت ہوگی۔ لیکن کبھی بھی پچاس ساٹھ آدمیوں سے زیادہ جلسے میں نہیں آئے۔ مولانا نے صدارت کی تب بھی معلوم ہوا کہ یہی حال رہا۔ بلکہ میکش نے "زمیندار" کے مزاحیہ کالم میں مولانا کی شان میں نازیبا الفاظ بھی لکھ دیئے۔ لکھا کہ معلوم ہونا چاہئے کہ مولانا احمد علی صاحب جنھوں نے انجمن حمایت اسلام کے جلسہ کی صدارت کی ہے کون ہیں۔ وہی مہاجر الی الکابل ثم الی الاہور۔ مولانا میرے استاد بھی تھے۔ میں ان سے "ترتیب آیات قرآنی" صف علماء میں باوجود فہم عربی سے قاصر ہونے کے پڑھتا تھا اور میرے بزرگ بھی تھے۔ میں نے زبانی اور تحریری بذریعہ اشاعت اخبار معافی مانگی۔ واقعہ یہ تھا کہ مولانا کابل سے جبراً ہندوستان بحکم مولانا عبید اللہ سندھی تعلیم قرآن کی اشاعت کے لئے واپس کئے گئے تھے اور بادل ناخواستہ محض بہ تعمیل ارشاد واپس آئے تھے۔ جیسا کہ ظفر حسن بیگ کی آپ بیتی سے بخوبی ظاہر ہے۔ ظفر حسن ایک ان تقریباً ایک درجن طالبعلموں

میں تھے جو ۱۹۱۵ء میں لاہور کالج کو چھوڑ کر بغرض جہاد ہجرت اختیار کر گئے
تھے۔ ایک کا اور مولانا عبید اللہ سندھی کا شب و روز کا ساتھ
رہا۔ اور انھوں نے آپ بیتی میں افغانستان، روس اور ترکی کے سفر
کے حالات بڑی وضاحت سے قلمبند کئے ہیں۔ مگر یہ سب تو جملہ معترضہ
تھا۔ میری غرض تو اس جوش جنون کو ظاہر کرنا ہے جو تحریک خلافت
اور تحریک ترک موالات کے زمانہ میں کارفرما تھا۔

مسٹر ذوالفقار علی خاں بیرسٹر انجمن حمایت اسلام کے ان
دنوں سکریٹری تھے۔ یہ وہی مسٹر ذوالفقار علی خاں ہیں جن کا تذکرہ
اقبال کے حسب ذیل اشعار میں آیا ہے۔

کیسے پتہ کی بات جگندر نے کل کہی
موٹر ہے ذوالفقار علی خاں کا کیا خموش

ہنگامہ آفریں نہیں اس کا خرام ناز
مانند برق تیز مثال ہوا خموش

میں نے کہا نہیں ہے یہ موٹر پہ منحصر
ہے جادۂ حیات میں ہر تیز پا خموش

مسٹر ذوالفقار علی نے علامہ اقبال پر انگریزی میں ایک کتاب
بھی شروع زمانے میں لکھی تھی۔ مسٹر ذوالفقار علی کو محسوس ہوا کہ انجمن اب
چل نہیں سکتی ہے کیونکہ سالانہ جلسہ ہی میں اس کا چندہ ہوا کرتا تھا۔
اور اب جلسوں میں کوئی شریک ہی نہ ہوتا تھا۔ چنانچہ وہ علامہ اقبال
سے ملے اور ان سے کہا کہ انجمن ٹوٹ رہی ہے اور یہ قوم کا بڑا خسارہ
ہے اور درخواست کی کہ اپنی کوئی تازہ نظم پڑھیں اور اس کا اعلان
کیا جائے۔ اقبال راضی ہو گئے اور مسٹر ذوالفقار علی خاں نے اس
کی شہرت دینے میں کوئی دقیقہ اٹھا نہ رکھا کہ علامہ اپنی ایک تازہ نظم
سنائیں گے۔ بدقسمتی کہ جس شام کو یہ جلسہ ہوا۔ مجھے سخت بخار

آگیا اور میں اس میں شریک نہ ہو سکا۔ لیکن مہر دیکشس وغیرہ گئے تھے۔ ان لوگوں کی زبانی معلوم ہوا کہ کوئی پچاس ہزار کا مجمع تھا اور صوبہ خلافت کمیٹی ضلع خلافت کمیٹی صوبہ کانگریس کمیٹی اور ضلع کانگریس کمیٹی کے تقریباً جملہ اراکین و عہدہ داران آئے تھے لوگ ترک موالات اور اس کا لائحہ عمل اور بائیکاٹ وغیرہ سب بھول گئے۔ اور حیرت پر حیرت یہ کہ بعد کو بھی کسی نے اس کے بارے میں کچھ نہیں کہا ایسا معلوم ہوتا تھا کہ گویا اقبال کے کلام کو تمام احکام اور منشاؤں سے مستثنیٰ کر دیا گیا ہو۔ علامہ اقبال کو عرق النسا کا عارضہ تھا اور انھوں نے میز پر بیٹھ کر ترنم سے اپنی غیر مطبوعہ نظم "خضر راہ" پڑھی۔

اس وقت کمیونزم کا روس پر تسلط ہو چکا تھا۔ جیسا کہ سب کو معلوم ہے۔ روس میں ۱۹۱۷ء میں زار کی سلطنت کا تختہ الٹ دیا گیا اور بالشویک برسر اقتدار آگئے اور جب بالشویک غالب آئے تو منشویک و دوسرے طاقتوں کو شکست دے کر روس سے خارج کر دیا گیا۔ اب لینن کا راج تھا۔ لینن کے متعلق جو کہانیاں ہندوستان آئی تھیں وہ انتہائی وحشت خیز تھیں۔ وہ تمرد اور سرکشی کے ساتھ خدا کے وجود کا انکار کرتا تھا۔ اور شاہی خاندان امراء اور متوسط طبقہ پر طرح طرح کے مظالم توڑتا تھا۔ وہ کارل مارکس کے حوالے سے کہتا تھا کہ "مذہب لوگوں کے لئے افیون ہے۔" اور اس مقولہ کو ماسکو کے سرخ میدان میں ایک نمایاں جگہ پر کندہ بھی کرا دیا تھا۔ یہ بھی مشہور تھا کہ وہاں نکاح کے قسم کی کوئی چیز نہیں ہے۔ نہ صرف یہ کہ تمام املاک حکومت کی ملکیت ہو گئے ہیں بلکہ اشتراک اموال کے ساتھ اشتراک عورات کا بھی قانون جاری

کر دیا گیا ہے۔ اور ان کے مال پر غریبوں اور ناداروں کو دست درازی کرنے سے روکتا ہے لہٰذا مذہب چونکہ ذاتی ملکیت کو جائز سمجھتا ہے اس لئے وہ قدامت پسند اور ناقص ہے۔ کیونکہ وہ غریبوں کو مالداروں کا غلام بناتا ہے اور کسانوں اور مزدوروں کو دائمی غلامی کی زنجیروں میں جکڑے رکھتا ہے۔ اس لئے مذہب سے اجتناب کر کے مزدور راج قائم کرنا چاہئے اور تمام عالم میں مزدوروں کی مطلق العنانی حکومت۔

DICTATOR SHIP OF THE PROLE TRIATE

قائم ہونا چاہئے اور ایسا نہیں ہو سکتا جب تک کہ مذہب کا جنازہ قطعی اٹھا نہ پھینکا جائے۔

اس تمہید کے بعد اب جلسہ کی سرگذشت بیان کی جاتی ہے جو لوگ موجود تھے۔ ان سے معلوم ہوا کہ لوگوں نے فوراً لکھنا شروع کیا تو علامہ نے منع کیا اور کہا کہ کوئی میرے اشعار نوٹ نہ کرے ایک بند پڑھتے تھے اور چندہ کا مطالبہ کرتے تھے اور دس دس ہزار روپیہ چندہ ہوتا تھا۔ جب حسبِ ذیل بند کی نوبت آئی:۔

بندۂ مزدور کو جا کر مرا پیغام دے — خضر کا پیغام کیا ہے یہ پیامِ کائنات
اے کہ تجھ کو کھا گیا سرمایہ دارِ حیلہ گر — شاخِ آہو پر رہی صدیوں تلک تیری برات
ساحر الموط نے تجھ کو دیا برگِ حشیش — اور تو اے بے خبر سمجھا اسے شاخِ نبات
نسل قومیت کلیسا سلطنت تہذیب رنگ — خواجگی نے خوب چن چن کر بنائے مسکرات
کٹ مرا ناداں خیالی دیوتاؤں کے لئے — سکر کی لذت میں تو لٹوا گیا نقدِ حیات
دستِ دولت آفریں کو مزد یوں ملتی رہی — اہلِ ثروت جیسے دیتے ہیں غریبوں کو زکوٰۃ

اٹھ کہ اب بزمِ جہاں کا اور ہی انداز ہے
مشرق و مغرب میں تیرے دور کا آغاز ہے

تو ایک شخص کھڑا ہو گیا اور اس نے پکار کر کہا کہ ہم ڈاکٹر اقبال کو سن رہے ہیں یا ڈاکٹر لینن کو۔ ہمیں کمیونزم کی تعلیم دی جا رہی ہے۔ علامہ اقبال نے فوراً تردید کی اور کہا کہ میں اسلام پیش کر رہا ہوں۔ اسلام کی یہی تعلیم ہے اور چند جملوں کی ایک مختصر تقریر کی۔

اس طویل تمہید سے یہ اندازہ ہوگا کہ علامہ اقبال کی شخصیت کا عوام و خواص پر کیا اثر قائم ہو چکا تھا۔ لیکن اس سے زیادہ یہ بات ثابت ہو گی کہ اسلام پر غلط نظریات کس طرح غالب آ گئے تھے۔ اور فکر اسلامی بادلوں میں چھپ گئی تھی۔ اسلام نے عرب سے تمام عالم کا سفر کیا۔ زمانہ سلف میں وہ جہاں گیا اس کے تخیلات غالب رہے اور اس کی ذہنی فتوحات کی کوئی انتہا نہ تھی۔ لیکن جب سلطان آ گئے۔ تو تاج و تخت کے لئے کشمکش جاری ہو گئی۔ اور امویوں کو خارج کر کے عباسیوں نے جو حکومت قائم کی وہ ایرانیوں کی مدد سے وجود میں آئی تھی اور ایرانی حکومت میں بے جا دخیل تھے۔ انجام یہ ہوا کہ عجمی کلچر خالص عربی تہذیب میں شامل ہو گیا یہی حال افکار عالیہ کا ہوا مفسرین و شارحین دنیا میں پھیلے ہوئے خیالات سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔ اور حقیقت اسلام پردہ میں چھپ کر رہ گئی۔ نوبت یہاں تک آ گئی تھی کہ سرمایہ داری کو جزو اسلام سمجھا جانے لگا تھا اور جب اقبال نے "بندۂ مزدور" کو خضر کا پیغام سنایا تو ایک چیخ بلند ہو گئی وہ مذہب جس کی تاریخ ہی سرمایہ دارانہ نظام اور سرمایہ داری سے مسلسل جہاد ہے اس میں مزدور کی جائز اجرت پر غوغا بلند ہو جانا اس زمانہ کے رجحانات کو ظاہر کرتا ہے۔ اقبال انہیں عجمی تخیلات کی اصلاح کا پیغام سنانے کے لئے زمزمہ سنج

ہوا تھا اور وہ اپنے کو عصرِ حاضر کا اسی طرح سے مسیح تصور کرتا ہے جس طرح کہ اپنے زمانہ میں حضرت مولانا رومؒ تھے چنانچہ وہ کہتا ہے کہ

چوں رومی در حرم دادم اذاں من　　ازو آموختم اسرارِ جاں من
بہ دورِ فتنۂ عصرِ کہن او　　بہ دورِ فتنۂ عصرِ رواں من

یعنی رومی کی طرح میں نے بھی حرم میں اذان دی ہے یعنی جس طرح حرم کا موذن پکارتا ہے کہ کاروبار دنیوی کو ترک کر کے حرم میں نماز پڑھنے چلو اسی طرح میں ملت اسلامیہ عالم کو آواز دے رہا ہوں کہ عجمی تصورات کے پھندے سے نکل کر خالص اسلام کے دائرے میں آؤ۔ اپنے زمانہ کے فتنہ کا سدباب کرنے کے لئے رومی تھی اور موجودہ زمانہ کے فتنہ کے سدباب کے لئے میں ہوں۔

چنانچہ وہ رسول پاک صلعم کی بارگاہ میں اپنے اس مشن کی کامیابی کے لئے فریاد کرتا ہے۔

مسلماں آں فقیرِ کج کلاہے　　رمید از سینۂ او سوزِ آہے
دلش نالا چرا نالا ندانم　　نگاہے یا رسول اللہ نگاہے

مسلمان تو ایک فقیر کج کلاہ تھا یعنی حکمرانی اور درویشی دونوں اس کے نصیب میں تھی لیکن اب اس کے سینہ سے ایک آہ رخصت ہو گئی۔ اس کا دل نالہ کرتا ہے کس طرح نالہ کرتا ہے کیا نالہ کرتا ہے اسے معلوم ہی نہیں یا رسول اللہ صلعم آپ ایک نگاہ کرم فرمائیے۔

اقبال نے جا بجا جو کچھ انگریزی اور اردو نثر میں بھی لکھا ہے۔ ان سے بھی یہی بات یقینی اور قطعی طور پر ثابت ہوتی ہے کہ اسلام جس دورِ انحطاط سے ذہنی اور سیاسی دونوں طرح پر گزر رہا تھا اس سے وہ بہت

متاثر تھے۔ اور وہ ایک طرف اس زمانے کے تمام مفکرین کی طرح اتحاد اسلام (یعنی اسلام ازم) کے ذریعے اسلام کا دنیوی اقتدار واپس لانا چاہتے تھے اور دوسری طرف ملتِ اسلامیہ میں جو غلط نظریات پیوست ہو گئے تھے۔ ان کی اصلاح کرنے کے خواہش مند تھے اور یہی وجہ تھی کہ انھوں نے اپنا کلام فارسی میں پیش کیا۔ فارسی زبان عموماً دنیائے اسلام میں سمجھی جاتی ہے اور کم سے کم فارسی کے ذریعہ وہ بہت سے اسلامی ملکوں میں اپنے خیالات کی تبلیغ و اشاعت کر سکتے تھے۔ اس طرح اقبال نہ صرف ایک مفکر اسلام تھا بلکہ ایک مجدد تھا اور اس نے آب سرچشمہ اسلام سے تشنگان معرفت کو سیراب کیا ہے۔ اس کو اسلام سے کاٹ کر محض شاعر کی حیثیت سے جانچنا اور پرکھنا اور صرف یہ کہہ دینا کہ اس کے کلام میں آفاقیت اور عالمگیریت ہے روز روشن سے انکار کے مترادف ہے۔ آفاقیت اور عالمگیریت ہم معنی الفاظ ہیں۔ اور اقبال نے ابہام کو اپنے نصب العین اور پیام کے پیش کرنے میں روا نہیں رکھا۔ وہ صاف صاف تاویل کی ادنیٰ ترین گنجائش دیے بغیر حقایق اسلام کو اجاگر کرتا ہے اور جب اپنا مقصد بیان کر لیتا ہے تو اس کو دل میں اتارنے کے لئے کبھی مناظر فطرت کا سہارا لیتا ہے۔ کبھی صبح صادق و طلوع آفتاب کی جانب اشارے کرتا ہے کبھی گورِ غریباں پر جا کر کھڑا ہو جاتا ہے اور اپنے مفہوم کو واضح کرنے کے لئے شاعرانہ محاکات کے وہ نوادر پیش کرتا ہے جو دنیائے ادب میں عدیم المثال ہیں۔ جناب مجنوں گورکھپوری ہندوستان میں ادب و تنقید کے اماموں میں تصور کیے جاتے ہیں ان کا فلسفہ اور تاریخ ادبیات کا مطالعہ بہت وسیع ہے۔ ایک مرتبہ دوران گفتگو انھوں نے

اقبال کے اس شعر پر سخت اعتراض کیا ہے

شب گریزاں ہوگی آخر جلوۂ خورشید سے
یہ چمن معمور ہوگا نغمۂ توحید سے

اور کہا کہ "نغمۂ توحید" کے الفاظ استعمال کر کے اقبال نے اپنی پوری نظم کا ستیاناس کر دیا۔ مجنوں صاحب کی غرض غالباً یہ تھی کہ شمع اور شاعر کا آخری بند بہت ہی بلند تھا۔ اور مبہم ہونے کی وجہ سے ہر جگہ چسپاں ہو سکتا تھا۔

آسماں ہوگا سحر کے نور سے آئینہ پوش
اور ظلمت رات کی سیماب پا ہوجائیگی

دیکھ لو گے سطوتِ رفتارِ دریا کا مآل
موجِ مضطر ہی اسے زنجیرِ پا ہوجائیگی

نالۂ صیاد سے ہوں گے نوا ساماں طیور
خونِ گلچیں سے کلی رنگیں قبا ہوجائیگی

اب حسبِ ذیل اشعار سے وہ عمومیت غائب ہو گئی اور یہ پیام امید صرف مسلمانوں کے لئے محدود ہو کر رہ گیا۔

پھر دلوں کو یاد آجائے گا پیغامِ سجود
پھر جبیں خاکِ حرم سے آشنا ہوجائیگی

آنکھ جو کچھ دیکھتی ہے لب پہ آ سکتا نہیں
محوِ حیرت ہوں کہ دنیا کیا سے کیا ہوجائیگی

شب گریزاں ہوگی آخر جلوۂ خورشید سے
یہ چمن معمور ہوگا نغمۂ توحید سے

مجنوں صاحب نے جو کچھ فرمایا وہ بالکل صحیح ہے اور اس میں کوئی شک نہیں کہ اقبال کا پیام اس حیثیت سے محدود ہے کہ وہ اسلام اور حقائق اسلام کی شرح ہے۔ لیکن ادب میں احتساب کا محکمہ قائم کرنا جائز نہیں ہے۔ اس کا کیا علاج کہ اقبال کی فکر و نظر میں کل آفاقیت اور عالمگیریت اسلام اور صرف اسلام ہی میں پنہاں ہے اور کیا اس عقیدے کے اظہار پر کسی قسم کی پابندی عائد کی جا سکتی ہے۔ اگر مارکسی ادب میں "سرخ سویرا"

جیسے کھلے ہوئے اشارے آ سکتے ہیں۔ اور اگر ان کی شاعری میں کھلم کھلا مذہب کو رد اور اس کے نتائج کو انہیں رنگوں ظاہر کیا جا سکتا ہے تو پھر اسلام کو کیوں نہ شاعرانہ انداز میں پیش کیا جائے۔ کرشن چندر اپنے ناول "جب کھیت جاگے" میں لکھتے ہیں۔ اسکو ایک شعر ہے پھر کیا ہا اسکو ایک خیال بھی ہے اور پھانسی سے پہلے ہیرو کو سرخ قمیص پہنائی جاتی ہے۔ آخر یہ سب کیا ہے۔ اور کیا اقبال نے یہ کوئی انوکھی بات کی ہے۔ اور اس کے پہلے کسی عظیم شاعر نے ایسا نہیں کیا۔ اور بہت سی مثالوں کو جانے دیجئے۔ مثنوی مولانا روم نے صدیوں تک اسلام کی تشریح و وضاحت و تبلیغ کا ایسا کام کیا کہ اس کا مطالعہ اور اس کی تعلیم اسلامی درس گاہوں کا ایک جزو بنی رہی اور علامہ اقبال نے اسلامی فکر و نظر کو عصر حاضر کے سانچے میں ڈھال کر وہی خدمت انجام دی ہے جو مثنوی مولانا روم نے صدیوں پہلے کی تھی چنانچہ مثنوی مذکور کے متعلق یہ ضرب المثل کے طور پر کہا جاتا تھا کہ

مثنوی مولوی معنوی
ہست قرآں در زبان پہلوی

یعنی مولانا روم کی مثنوی فارسی زبان میں قرآن ہے یعنی قرآن کی جو تعلیم ہے بجنسہ وہی تعلیم مثنوی مذکور میں دی گئی ہے۔ اقبال کا کلام اس ادعا سے بھرا ہوا ہے کہ وہ مولانا روم کا متبع ہے اور اس کو ہر جگہ مرشد معنوی کے نام سے یاد کرتا ہے اور اس نے وہی کام عصر حاضر میں کیا ہے جو مولانا روم نے پہلے کیا تھا۔

مطرب غزلے بیتے از مرشد روم آور
تا غوطہ زند جانم در آتش تبریزے

یہ اور بات ہے کہ جناب مجنوں گورکھپوری اور دوسرے مارکس ازم کے معتقدین کو اسلام سے عار آتی ہو۔ جس طرح ممکن ہے کہ ایک بلغم گو یا کسی

ادب کے اس فلسفے سے نفرت معلوم ہوتی ہے جس کو ڈاکٹر اقبال نے ایک مصرعہ میں ظاہر کیا ہے۔

بر مساوات شکم دارد اساس

مارکسی عقائد کے لوگوں کا تو یہ حال ہے کہ یہ لوگ ادب میں پروپیگنڈہ کرتے ہیں۔ ادب میں پروپیگنڈا ایک سخت معیوب بات ہے۔ ادب کا پروپیگنڈا ہمیشہ سے جائز رہا ہے اور ہمیشہ جائز رہے گا کیونکہ ادب کی تخلیق بلا اس کے ممکن نہیں ہے کہ حیات و کائنات کے بارے میں ذہن کے اندر پختہ عقائد و نظریات ہوں۔ ان عقائد و نظریات کو حسین الفاظ میں حسنِ بیان اور ندرتِ اظہار کے ساتھ واضح کرنا کمالِ فن ہے۔ مارکسی حضرات جنھوں نے "ترقی پسند ادب" کے خوش نما الفاظ کا نقاب اپنے چہروں پر ڈال لیا ہے۔ روس کی بدلتی ہوئی پالیسی کے ساتھ ساتھ چلتے ہیں اور ادب اور فن کو جائز طور پر استعمال کرتے ہیں۔ مثلاً جب ہندوستان زمانہ جنگِ عظیم میں برطانیہ سے پوچھ رہا تھا کہ آپ جنگ کا مقصد واضح کریں اور عوام لڑائی سے تنگ آ گئے ہوئے تھے آزادی کی موت و حیات کی جنگ لڑ رہے تھے مکانات پھونکے جا رہے تھے۔ بچے اٹھا اٹھا کر آگ پر پھینک کر مار ڈالے جاتے تھے۔ والنٹیروں کو گھوڑوں سے روندا جاتا تھا۔ [illegible] دنیا میں آزادی کے رضاکار رولی پر گھسیٹے کھینچے جاتے تھے اور پھر نکال کر ان کو پیٹا جاتا تھا۔ اور پھر پانی میں کھڑا کیا جاتا تھا۔ مال و املاک قرق ہو رہے تھے اور ظلم و ستم کا پہاڑ توڑا جا رہا تھا۔ ان حالات میں یہ حضرات صرف اس لئے کہ روس برطانیہ کی طرف تھا اسے جنگِ آزادی قرار دینے میں منہمک تھے اور اپنے فن کا پورا زور اس پر صرف کر رہے تھے۔ ملاحظہ ہو۔

یہ جنگ ہے جنگِ آزادی کے پرچم کے تلے
ہم ہندی اور ہم افرنگی ہم چینی جانبازانِ وطن
ہم سرخ سپاہی ظلم شکن آہن پیکر فولاد بدن
یہ جنگ ہے جنگِ آزادی کے پرچم کے تلے

ان کے کانوں میں اس وقت بیواؤں کی آہیں، یتیموں کی کراہ، مظلوموں کی سسکیاں آتی تھیں۔ اور بلا تفریق ختم ہو جاتی تھیں۔ اسی طرح ان لوگوں نے پہلے پاکستان بننے کی موافقت کی پھر مخالفت کی۔ ہر موڑ پر ان کی نگاہ روس کی پالیسی پر رہتی ہے اور اسی قسم کا لٹریچر یہ پیدا کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ یہ ہے ادب میں پروپیگنڈا جو قابلِ اعتراض ہے۔ کسی شخص کو حق ہے کہ وہ بت شکنی یا انکارِ خدا کو اپنا مطمحِ نظر بنائے خالص فنی بنیادوں پر اس کا کلام تولا جائے گا اور دیکھا جائے گا کہ حیات و کائنات پر وہ فرار کی راہ اختیار کرتا ہے یا جدوجہدِ زندگی میں حصہ لے کر امید کا پیغام دیتا ہے۔ بنیادی عقائد و تصورات پر کوئی پابندی نہیں لگائی جا سکتی۔

اب غور کیجیے کہ اگر اقبال "شمع اور شاعر" کے آخری بند میں "حرم" اور "توحید" کے الفاظ نہ لاتا تو کسی کی سمجھ میں کیا آتا کہ وہ کیا کہنا چاہتا ہے۔

اسی طرح اپنی نظم "مسلم" میں پہلے وہ اپنے کو مخاطب کر کے کہتا ہے کہ

گوش آوازِ سرودِ رفتہ کا جویا ترا	اور دل ہنگامۂ حاضر سے بے پروا ترا
قصۂ گل ہم نوایانِ چمن سنتے نہیں	اہلِ محفل تیرا پیغامِ کہن سنتے نہیں

اے صدائے کارواں خضرِ پا خاموش ہو   ہے بہت یاس آفریں تیری صدا خاموش ہو

زندہ پھر وہ محفلِ دیرینہ ہو سکتی نہیں
شمع سے روشن شبِ دوشینہ ہو سکتی نہیں

پھر امید کے چراغ جلا کر پیام دیتا ہے۔

ہم نشیں مسلم ہوں میں توحید کا حامل ہوں میں
اس صداقت پر ازل سے شاہدِ عادل ہوں میں

حق نے عالم اس صداقت کے لیے پیدا کیا
اور مجھے اس کی حفاظت کے لیے پیدا کیا

میری ہستی پیرہنِ عریانیِ عالم کی ہے
میرے مٹ جانے سے رسوائی بنی آدم کی ہے

کب ڈرا سکتا ہے غم کا عارضی منظر مجھے
ہے بھروسا اپنی ملت کے مقدر پر مجھے

یادِ عہدِ رفتہ میری خاک کو اکسیر ہے
میرا ماضی میرے استقبال کی تفسیر ہے

اسی طرح "دیرینہ گفتن" پر عمل کر کے اقبال نے اپنا مقصد پورا کیا اگر وہ یہ نہ کرتا تو اس کا پیغام تشنہ رہ جاتا پیغام کی نوعیت ہی صاف گوئی کی متقاضی تھی بس "دورِ رفتہ" کو از سرِ نو جگانا اور "محفل دیرینہ" کو زندہ کرنا اور "شبِ دوشینہ" میں سحر کا نور بھرنا اقبال کا منشائے خیال ہے۔ اسی طرح ایک دوسری نظم میں یہ کہنے کے بعد کہ

مشرق خراب و مغرب ازاں بیشتر خراب
عالم تمام مردہ و بے ذوقِ جستجو است

یعنی مشرق خراب اور مغرب اس سے زیادہ خراب ہے۔ عالم تمام مردہ ہو چکا اور اس میں ذوق جستجو باقی نہیں ہے۔ اس طرح پیغام دیتا ہے ؎

ساقی بیار بادہ و بزم شبانہ ساز ‏ ‏ ‏ ما را خراب یک نگہ محرمانہ ساز

یعنی اے ساقی شراب لا اور بزم شبانہ کو پھر آراستہ کر اور نگاہ محرمانہ سے ہم کو بدمست کر دے۔ یعنی اقبال کے خیال میں "نگہ محرمانہ" "بلا بزم شبانہ آراستہ کے ممکن ہی نہیں ہے۔ اقبال کے ہاں لفظ "ساقی" بھی ایک خاص معنی میں استعمال ہوتا ہے۔ عام ادب میں شاعر کے ماسوا کوئی ہستی ہے لیکن اقبال جو اپنی فطرت کے سوز میں جلنا ہی اصل حیات تصور کرتا ہے۔ اکثر جگہ ساقی سے مراد خود کو لیتا ہے۔ چنانچہ دیکھئے ؎

خیر تو ساقی سہی لیکن پلائے گا کسے
اب نہ وہ میکش رہے باقی نہ میخانے رہے

دوسری جگہ کہتا ہے :-

نشہ پلا کے گرانا تو سب کو آتا ہے ‏ ‏ ‏ مزہ تو جب ہے کہ گرتوں کو تھام لے ساقی
جو بادہ کش تھے پرانے وہ اٹھتے جاتے ہیں ‏ ‏ ‏ کہیں سے آب بقائے دوام لے ساقی
کٹی ہے رات تو ہنگامہ گستری میں تری
سحر قریب ہے اللہ کا نام لے ساقی

حیات بعد الممات

اسی طرح مناظر فطرت کی عکاسی میں کمال فن ظاہر کرنے کے بعد اپنا پیام کبھی نہیں بھولتا چکبست کا حسب ذیل شعر بہت مشہور ہے ؎

زندگی کیا ہے عناصر کا ظہور ترتیب
موت کیا ہے۔ انہی اجزا کا پریشاں ہونا

شعری خوبیوں کے لحاظ سے کیا خوب ترتیب ہے۔ اور اس کی جتنی بھی داد دی جائے کم ہے۔ لیکن معنوی اعتبار سے مادہ پرستی کی تعلیم ہے۔ عناصر کے ظہور ترتیب سے زندگی بن گئی اور یہی اجزا پریشان ہو گئے تو ان کا نام موت ہے یعنی موت کے بعد کچھ نہیں ہے۔ یہ زندگی اور موت صرف نیچر کا ایک کھیل ہے اس کے مقابلے میں اقبال موت کو ایک جدید اور دائمی حیات کا دروازہ قرار دیتا ہے۔ اس طرح حیات بعد الممات کے فلسفہ کو پیش کرتا ہے ؎

موت کو سمجھے ہیں غافل اختتام زندگی
ہے یہ شام زندگی صبح دوام زندگی

اسی طرح والدۂ مرحومہ کی یاد میں جو طویل فلسفیانہ مرثیہ لکھا ہے،
اس میں یہی پیغام دیتا ہے ؎

زندگی محبوب ایسی دیدۂ قدرت میں ہے
ذوقِ حفظِ زندگی ہر چیز کی فطرت میں ہے
موت کے ہاتھوں سے مٹ سکتا اگر نقشِ حیات
عام یوں اس کو نہ کر دیتا نظامِ کائنات
موت تجدیدِ مذاقِ زندگی کا نام ہے
خواب کے پردے میں بیداری کا اک پیغام ہے

آگے چل کر کن مرصع الفاظ میں اور حسنِ بیان کی بے پایاں
خوبیوں کے ساتھ کس طرح اسی خیال کو ادا کیا ہے اور اس میں فطرت
کی عکاسی کا کیسا عجیب مرقع ہے ؎

پردۂ مشرق سے جس دم جلوہ گر ہوتی ہے صبح
داغ شب کا دامنِ آفاق سے دھوتی ہے صبح
لالۂ افسردہ کو آتش قبا کرتی ہے یہ
بے زباں طائر کو سرمستِ نوا کرتی ہے یہ
سینۂ بلبل کے زنداں سے سرود آزاد ہے
سیکڑوں نغموں سے بادِ صبح دم آباد ہے
خفتگانِ لالہ زار و کوہسار و رود بار
ہوتے ہیں آخر عروسِ زندگی سے ہمکنار
یہ اگر آئینِ ہستی ہے کہ ہو ہر شام صبح
مرقدِ ہستی کی شب کا کیوں نہ ہو انجام صبح

حیات بعد الممات سے حیات ابدی بھی کہہ لیجئے۔ اسلام کا سنگ بنیاد ہے۔ اور اسی کی مسلسل حرکت سے روح انسانی برابر مدارج ترقی طے کرتی جائے گی۔ وہ موت سے مرتی نہیں اور جاودانی ہے اور رواں دواں چلی جا رہی ہے۔ اس کو اقبال نے طرح طرح سے بیان کیا ہے۔ "اختر صبح" کے عنوان سے یہ لکھنے کے بعد کہ صبح کا ستارا روتا تھا اور کہتا تھا کہ میری بھلا بساط ہی کیا ہے میں تھوڑی دیر میں ختم ہو جاتا ہوں۔ مجھے حباب کا نفس اور شرارے کی تابندگی ملی ہے۔ اقبال اپنا تسکین دہ جواب اس طرح سناتا ہے کہ اگر تجھے غم فنا ہے تو گنبد فلک سے اتر کر مثل شبنم میرے ریاض سخن کی جاں پرور فضا میں اترے

میں باغباں ہوں محبت بہار ہے اس کی
بنا مثال ابد پائدار ہے اس کی

اس طرح "چاند اور تارے" میں تارے چاند سے کہتے ہیں کہ ہم کو تو ہمیشہ چلنا ہی چلنا ہے تو کیا ہماری منزل کبھی آئے گی ہم تھک گئے تو چاند نے جواب دیا۔

جنبش سے ہے زندگی جہاں کی یہ رسم قدیم ہے یہاں کی

اور اسی طرح ساحل افتادہ اور موج کی کہانی بیان کی ہے۔

ساحل افتادہ گفت گرچہ بسے زیستم ہیچ نہ معلوم شد آہ کہ من کیستم
موج ز خود رفتہ تیز خرامید و گفت ہستم اگر می روم گر نہ روم نیستم

ساحل افتادہ جو بے حرکت رہتا ہے اس نے کہا کہ میں اگرچہ بہت دنوں زندہ رہا لیکن افسوس مجھ کو کچھ معلوم نہ ہوا کہ میں کون ہوں۔ از خود رفتہ موج تیزی سے چلی اور اس نے یہ راز بتلایا کہ زندگی حرکت کا نام

ہے. اگر میں چلوں تو میں ہوں اور اگر نہ چلوں تو نہیں ہوں۔
اس طرح صبح کا نقشہ بڑی ندرت سے اس طرح کھینچنے کے بعد کہ

اُجالا جب ہوا رخصت جبینِ شب کی افشاں کا
نسیمِ زندگی پیغام لائی صبحِ خنداں کا

کہتا ہے :

سوئے گورِ غریباں جب گئی زندوں کی بستی سے
تو یوں بولی نظارہ دیکھ کر شہرِ خموشاں کا
ابھی آرام سے سوتے رہو میں پھر بھی آؤں گی
سلا دوں گی جہاں کو خواب سے تم کو جگا دوں گی

یہ قیامت کا نقشہ ہے جب سارا عالم فنا ہو جائے گا اور مردے قبروں سے اٹھیں گے اور حیات بعد الممات کی دوسری منزل شروع ہوگی پہلی منزل قبر سے قیامت تک تھی اور حرکت سے مراد وہی روح کا مسلسل سفر ہے جس پر پہلے بحث ہو چکی "حیاتِ ابدی" کے عنوان سے لکھا ہے :

زندگانی ہے صدف قطرۂ نیساں ہے خودی
وہ صدف کیا کہ جو قطرے کو گہر کر نہ سکے
ہو اگر خود نگر و خود گر و خود گیر خودی
یہ بھی ممکن ہے کہ تو موت سے بھی مر نہ سکے

موت کا نقشہ اس طرح کھینچا ہے کہ :

لحد میں بھی یہی غیب و حضور رہتا ہے
اگر ہو زندہ تو دلِ ناصبور رہتا ہے
ستارہ مثالِ شرارہ یک دو نفس
مئے خودی کا ابد تک سرور رہتا ہے
فرشتہ موت کا چھوتا ہے گو بدن تیرا
ترے وجود کے مرکز سے دور رہتا ہے

اس کے بعد شباب کا ملاحظہ کیجیے :

فریبِ نظر ہے سکون و ثبات — تڑپتا ہے ہر ذرہ کائنات
ٹھہرتا نہیں کاروانِ وجود — کہ ہر لحظہ ہے تازہ شانِ وجود
سمجھتا ہے تو راز ہے زندگی — فقط ذوقِ پرواز ہے زندگی
بہت اس نے دیکھے ہیں پست و بلند — سفر اس کو منزل سے بڑھ کر پسند
خودی کیا ہے رازِ درونِ حیات — خودی کیا ہے بیداریٔ کائنات
ازل اس کے پیچھے ابد سامنے — نہ حد اس کے پیچھے نہ حد سامنے
سفر اس کا انجام و آغاز ہے — یہی اس کی تقدیم کا راز ہے
ازل سے یہ ہے کشمکش میں اسیر — ہوئی خاکِ آدم میں صورت پذیر

یہ عالم یہ ہنگامۂ رنگ و صوت — یہ عالم کہ ہے زیرِ فرمانِ موت
یہ عالم یہ بت خانۂ چشم و گوش — جہاں زندگی ہے فقط خور و نوش
خودی کی ہے یہ منزلِ اولیں — مسافر یہ تیرا نشیمن نہیں
بڑھے جا یہ کوہِ گراں توڑ کر — طلسمِ زمان و مکاں توڑ کر

اقبال کے ہاں "حرکت" اور "سفر" تقاضائے حیات ہیں۔ "سکون پرستی" نہ صرف غلط بلکہ ایک مرض ہے۔ فلسفۂ اقبال میں اس کے خاص معنی ہیں۔ جب انسان اپنی انا (ایغو) کو بھول جاتا ہے اور اسے اللہ تعالیٰ میں جذب کر دینے کا طالب ہوتا ہے تو گویا اس کی ایک منزل قرار دیتا ہے۔ حالانکہ "روحِ انسانی" جو ہر وقت انسان کو اپنا وجود یاد دلاتی رہتی ہے۔ منزل اور قیام سے بیگانہ ہے۔ اس کا ایک وجود ہے اور جس رنگ میں نمودار ہو اپنی ہستی برقرار رکھتی ہے۔ بچہ، جوان اور بوڑھا ہوتا ہے لیکن اس کے اندر ایک احساس باقی رہتا ہے کہ وہ وہی ہے یہ ہے خودی کا وجود اور

پھر اس تقویم پر قائم رکھ کر ابد الآباد تک ترقی کرتی چلی جاتی ہے۔ وہ لافانی اور ابدی ہے۔ اسی سے یہ شاخ بھی پھوٹتی ہے کہ کشمکش حیات میں حصہ لے کر جد و جہد کا میدان آراستہ کیا جائے۔ اور روح انسانی کا غلط تصور جب وحدت الوجود کے عقیدے کے سانچے میں ڈھلتا ہے تو اس سے جہاد زندگی سے گریز اور فرار کی راہ پیدا ہوتی ہے۔

جس حال میں اقبال نے مسلمانوں کے ذہن و دماغ کو پایا، اس کا ذکر جگہ جگہ کیا ہے اور بڑی ہی وضاحت سے اس کا تذکرہ کیا ہے۔ عجمی تخیلات جس طرح مسلمانوں پر مسلط ہو گئے تھے جس سے اصل حقیقت مذہب اسلام پوشیدہ ہو گئی تھی۔ اس کا بڑے پر زور الفاظ میں تذکرہ ملتا ہے ملاحظہ ہو

مسلمان ہے توحید میں گرم جوش
مگر دل ابھی تک ہے زنار پوش

تمدن تصوف شریعت کلام
بتان عجم کے پجاری تمام

شریعت روایات میں کھو گئی
یہ امت خرافات میں کھو گئی

بجھی عشق کی آگ اندھیر ہے
مسلمان نہیں راکھ کا ڈھیر ہے

شیطان نے ایک مجلس شوریٰ منعقد کی ہے اور دریافت کر رہا ہے کہ اہل بیت کو کیا خطرات درپیش ہیں۔ ہر ایک اپنے فہم کے مطابق جب رائے دے چکا تو شیطان کہتا ہے ؎

ہے خطرہ کوئی اگر مجھ کو اس امت سے ہے
جس کی خاکستر میں ہے اب تک شرار آرزو

خال خال اس قوم میں اب بھی نظر آتے ہیں وہ
کرتے ہیں اشک سحر گاہی سے جو ظالم وضو

اور اس پر موجودہ انحطاط اور کمزوری کو دیکھتے ہوئے اخوان الشیاطین کے لبوں پر مسکراہٹ آئی ہوگی تو پھر وہ یوں تشریح کرتا ہے

جانتا ہوں میں یہ اُمت حاملِ قرآں نہیں
ہے وہی سرمایہ داری بندۂ مومن کا دیں
جانتا ہوں میں کہ مشرق کی اندھیری رات میں
بے یدِ بیضا ہے پیرانِ حرم کی آستیں
عصرِ حاضر کے تقاضاؤں سے ہے لیکن یہ خوف
ہو نہ جائے آشکارا شرعِ پیغمبر کہیں

یہ تو شاعرانہ فن کاری کے سلسلے کی بات ہے کہ خواہ شاعر کوئی بات ابلیس کی زبان سے کہے یا جبریل کی زبان سے لیکن اس سے حسب ذیل باتیں ثابت ہوئیں :-

(۱) اقبال کو شدت سے اس کا احساس تھا کہ عجمی تخیلات نے اندھے ابر کی طرح آفتابِ اسلام کو چھپا لیا ہے اور اس بادل کو اڑانا اور آفتاب کی کرنوں سے عالم کو منور کرنا ہے۔

(۲) اس کا پختہ عقیدہ ہے کہ اسلام دینِ فردا ہے اور خود دنیا ذہن کی جن ارتقائی منزلوں سے گذر رہی ہے اور ان کا تقاضا یہ ہے کہ پیغمبر علیہ السلام کا لایا ہوا دین آشکارا ہو کر رہے

مسلم ہستی سینہ را از آرزو آباد دار
ہر زماں پیشِ نظر لا یخلف المیعاد دار

یعنی اگر تو مسلم ہے تو اپنا سینہ امید سے آباد رکھ اور ہر وقت اس کا دھیان رکھ کہ اللہ تعالیٰ کا وعدہ کبھی غلط نہیں ہو سکتا۔ اور وہ

اشارہ ہے اس جانب کہ اسلام تمام ادیان پر فائق ہو کر رہے گا۔

ادّعا

اقبال نے بہت صاف لفظوں میں اس کا دعویٰ بھی کیا ہے کہ شاعری جو عرف عام میں معانی رکھتی ہے۔ اس سے اس کا کوئی سروکار نہیں ہے بلکہ وہ اس پیغام کو پیش کر رہا ہے جو جبریل امین رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس لائے تھے۔ اور بے عقل و عش وہ ہدایت و مرشد کا مبلغ ہے چنانچہ کہتا ہے۔

نیاید خیر ازاں مرد فرو دست   کہ بر من تہمتِ شعر و سخن بست
اگر آبم بدریائے نگنجم   اگر خاکم بصحرائے نگنجم
نہاں تقدیرہا در پردۂ من   قیامت ہا بغل پروردۂ من
بجبریل امیں ہم داستانم   رقیب و قاصد و درباں ندانم

یعنی اقبال للکارتا ہے کہ اگر کوئی شخص میرے اوپر شعر و سخن کی تہمت باندھتا ہے۔ تو خبردار اس تنک ایسے شخص سے کسی بھلائی کی امید نہ رکھنا میں اگر پانی ہوں تو دریا میں نہیں سما سکتا۔ میں اگر خاک ہوں تو صحرا میں نہیں سما سکتا۔ تقدیریں میری جلو میں پرورش پاتی ہیں اور قیامتیں میری بغل پروردہ ہیں یہ سب اس لئے ہیں جبریل امین کا ہم داستاں ہوں۔ رقیب قاصد اور دربان کی مجھے حاجت نہیں حاصل یہ کہ میں اسی طرح پیغام ربانی کو پیش کرتا ہوں جس طرح جبریل امین اصلی حالت میں خدا کے سچے نبی محمد الرسول اللہ صلعم کے پاس لائے تھے۔

بعض کم فہم لوگوں نے اقبال پر اعتراض کیا ہے کہ وہ اپنے ذات کی شاعرانہ تعلی میں اس حد سے بڑھ گئے کہ اپنے کو ثانی جبریل امین قرار دے دیا اور یہ ایک عظیم گستاخی ہے لیکن مجھے تو کوئی ایسی بات نظر نہیں آئی بلکہ مجھے اس شعر پر وجد آتا ہے اس ایک شعر میں کہ ؎

بجبریل امین ہم داستانم
رقیب و قاصد و درباں ندانم

اقبال نے اپنے پیام کا نچوڑ پیش کر دیا ہے۔ وہ کسی طرح اپنی ذات کو درمیان میں نہیں لایا بلکہ اپنے کلام اور اپنے پیغام کی بابت کہہ رہا ہے اور اگر سادہ لفظوں میں خلاصہ کے طور پر بیان کیا جائے تو یہ ہوگا کہ میں جو کچھ کہہ رہا ہوں وہ وہی ہے جو جبریل امین نبی پاک صلعم کے پاس لے کر آئے تھے۔ یہ ادعا بذات خود اس نظریے کو ثابت کرنے کے لئے کافی ہے کہ اقبال نے اسلام کو اپنی اصلی اور خالص صورت میں پیش کرنے کے لئے اپنے کلام پر محنت کی تھی۔

اسی طرح ایک جگہ اپنے مرشد رومی کے پیغام کی بھی وضاحت کی ہے۔ اقبال مولانا روم سے بڑی گہری عقیدت رکھتے تھے اور جا بجا انھوں نے آشکارہ کیا ہے کہ فکر و نظر کی منزل میں انھوں نے کل اکتساب مولانا روم ہی سے کیا ہے چنانچہ ایک جگہ غالب اور رومی کا مقابلہ کیا ہے۔ برونگ نے کہا کہ میرے ساغر میں آبِ خضر کی آمیزش ہے۔ بائرن نے جگر کے پانی کو ساغر میں لایا اور غالب نے گرم جوشی میں آبگینہ کو پگھلا کر مے میں اس کی آمیزش کی۔ آخر میں جب مولانا روم کا نمبر آیا تو وہ فرماتے ہیں ؎

آمیزشے کجا گہر پاک او کجا
از تاک بادہ گیرم و در ساغرِ انگبم

یعنی کہاں وہ گہر پاک اور کہاں آمیزش، میں تو خوشۂ انگور سے بادۂ خالص نچوڑتا ہوں اور اسی کو اپنے ساغر میں ڈالتا ہوں۔ یہاں بھی مقصد وہی ہے کہ رومی کا پیام خالص وہی پیام ہے جو سردار دو جہاں رسول اللہ صلعم کے پاس جبریل امین لائے تھے۔ مرشد رومی و مرید ہندی دونوں کا مقصد اور منصب ایک ہی ہے۔

اگرچہ اقبال کے کلام کو اقبال کی زندگی سے خواہ وہ ذاتی ہو یا سیاسی مطابق کرنا اقبال کے ساتھ انصاف نہیں ہے۔ مولانا عطاء اللہ شاہ بخاری مزاحاً کہا کرتے تھے کہ اس کی شان میں تو قرآن کی آیت "یقولون مالا یفعلون" نازل ہے۔ قرآن پاک میں شعراء کا جہاں ذکر آیا ہے وہاں یہ کہا گیا ہے کہ وہ جو کہتے ہیں وہ کرتے نہیں خود اقبال نے اپنے بارے میں بار بار اس کا اظہار کیا ہے ؎

اقبال بڑا اپدیشک ہے من باتوں سے موہ لیتا ہے
گفتار کا یہ غازی تو بنا کردار کا غازی بن نہ سکا

اور کہتا ہے ؎

جو بے نماز کبھی پڑھتے ہیں نماز اقبال
بلا کے دیر سے مجھ کو امام کرتے ہیں

میں ایک دن علامہ اقبال کی محفل میں بیٹھا تھا اب وہ مجھے جان گئے تھے اور زمیندار اخبار میں میرے ایڈیٹوریل مضامین سے خوش ہو کر کئی مرتبہ مجھے چائے بلا چکے تھے کہنے لگے کہ آپ وسط ایشیا میں جا کر کام کیجئے۔ اس وقت

وہ صحیح میدان ہے اور خود ہی کہنے لگے کہ آپ کے دل میں سوال پیدا ہوگا کہ میں ایسا کیوں نہیں کرتا تو میرا جواب یہ ہے کہ میرے اندر ذوقِ یقین اور جذبۂ صادق تو موجود ہے لیکن توفیقِ عمل نہیں ہے۔ اس موقع پر ایک صاحب بول اٹھے کہ جی ہاں! اسی لیے تو آپ نے کہا بھی ہے کہ ؎

از خاکِ سمرقند ترم کہ دگر خیزد
آشوب ہلاکوئے ہنگامہ چنگیزے

علامہ نے چونک کر کہا کہ میرے شعر کا یہ مطلب نہیں ہے۔ میں نے سمرقند نہیں کہا بلکہ سمرقند سے کہا ہے اور میرا منشا یہ ہے کہ جس طرح ہلاکو کی غیر متمدن طاقت نے بغداد کی متمدن حکومت کا تختہ الٹ دیا تھا اسی طرح کوئی غیر متمدن قوم اٹھے گی اور یورپ کی متمدن حکومتوں کی بساط الٹ دے گی۔ مطلب یہ ہے کہ اقبال کی شاعری وجدان کا کرشمہ اور ذولیت از پیغمبری ہے جیسا کہ وہ خود کہتا ہے ؎

اقبال بھی اقبال سے آگاہ نہیں ہے
کچھ اس میں تصنع نہیں واللہ نہیں ہے

اور اس کا گناہ اس کے اعمال اور زندگی سے کماحقہ لگانا صحیح نہ ہوگا لیکن پھر بھی اقبال کے افکار جو نثر میں اصولِ حیات کے متعلق ہیں ان کو اس کے کلام کی تشریح میں پیش کیا جا سکتا ہے۔ چنانچہ جا بجا انھوں نے اپنے مضامین میں پرزور طریقہ سے اس کا اظہار کیا ہے کہ ایک واحد اجتماعی نظام تمام عالم کا اگر بنایا جائے تو سوائے نظام اسلام کے اور کوئی اجتماعی نظام ذہن میں آ ہی نہیں سکتا۔ علامہ نے تاریخ ادیان کے مطالعہ کے طور پر یہ بھی لکھا ہے کہ "دین" پہلے قومی تھا بعد میں نسلی قرار پایا جس سے یہ

تصور ہی پیدا ہوئی کہ دین پرائیویٹ عقائد کا نام ہے۔ اسی وجہ سے انھوں نے جارحانہ وطنیت کی بھی مخالفت کی ہے یعنی وہ وطنیت جو محرک جذبات انسانی کا واحد ذریعہ قرار دیا جائے۔ ویسے اپنے ملک وطن سے جہاں وہ پیدا ہوا ہے۔ محبت کرنا ہر انسان کے لئے ضروری ہے۔ اور اس سے اور عالمی اجتماعی نظام سے جو معتقدات کی بنا پر قائم ہو کسی قسم کا تصادم یا دونوں میں کسی طرح کا تضاد نہیں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اگر کلام اقبال کا سرسری جائزہ بھی لیا جائے تو یہاں ایک طرف وہ مضبوط اسلامی عقاید کا اظہار کرتا ہے دوسری جانب وطن کی محبت میں سرشاری بھی اس کا شعار ہے۔ اگرچہ جیسا کہ میں نے کہا اقبال اور کلام اقبال میں دو چیزیں اور ایک کو دوسرے سے کلیتاً مطابق کرنا صحیح نہ ہوگا۔ مثلاً علامہ اقبال نے سب سے پہلے بحیثیت صدر مسلم لیگ "پاکستان" کا تخیل دیا لیکن اقبال کے کلام میں پاکستان کی جانب ادنیٰ اشارہ بھی کہیں نہیں ملے گا لیکن کوئی پیام خواہ وہ نظم میں ہو یا نثر بلا پختہ عقاید کے پیش نہیں کیا جا سکتا۔ چنانچہ وہ خود کہتا ہے ؎

دین ہو فلسفہ ہو فقر ہو سلطانی ہو
ہوتے ہیں پختہ عقائد کی بنا پر تعمیر

اور اقبال کے کلام کا یہ پہلو کہ وہ اسلام کو اپنی اس صورت و رنگ میں پیش کرتا ہے تو ابتدائے نزول وحی سے ختم وحی تک پیغمبر اسلام صلعم پر نازل ہوا تھا۔ بحث سے بالاتر ہو جاتا ہے۔

اسرارِ خودی کی کہانی

چوں رومی در حرم دادم اذاں من — ازو آموختم اسرارِ جاں من

بہ دورِ فتنۂ عصرِ کہن او — بہ دورِ فتنۂ عصرِ رواں من

اسرارِ خودی کی ابتدا میں علامہ اقبال نے ایک کہانی لکھی ہے وہ کہتے ہیں کہ میں محوِ خواب تھا کہ رومی کو دیکھا وہ رومی کہ جس نے فارسی کے الفاظ میں قرآن لکھا۔ وہ کہ بحرفِ پہلوی قرآن نوشت ہی سے حقیقت بے نقاب ہو جاتی ہے یعنی رومی کا کلام وہی ہے جو عربی میں قرآن پاک کی تعلیم ہے۔ اس لئے خود ان کے کلام کو یہ منصب مریدی وہی درجہ حاصل ہو گا۔ بہر حال مولانا روم نے آکر اقبال سے کہا کہ میری مثنوی جس زمانے کے لئے لکھی گئی تھی وہ یکسر بدل گیا اور جدید تخیلات اور نئے مسائل ذہن کے سامنے آگئے ہیں۔ اس لئے اب تم ایک دوسری مثنوی لکھو جس سے وہی مقصد حاصل ہو۔ چنانچہ بیدار ہونے کے بعد انھوں نے کمر ہمت باندھی اور لکھنا شروع کیا۔ عام طور پر یہ خیال ہے کہ جس طرح اقبال نے اپنے آسمانوں پر جانے اور وہاں لوگوں سے ملاقات کرنے کے واقعات تمثیلاً لکھے ہیں یا جس طرح مکالمۂ ابلیس و جبریل میں اپنے مقصد کی وضاحت کے لیے فنکارانہ مہارت ظاہر کی ہے۔ اسی طرح اس خواب کا قصہ بھی ایک برجستہ تمہید یا ایک شاعرانہ تعلّی ہے۔ حقیقت سے اس کا واسطہ نہیں لیکن میں نے علامہ موصوف کے قریبی لوگوں سے با تحقیق سُنا ہے کہ وہ خود فرماتے تھے کہ یہ ایک واقعہ ہے بہر حال یہ ایک واقعہ ہو یا داستان سرائی دونوں کا نتیجہ جہاں تک موضوعِ سخن کا

تعلق ہے ایک ہی جگہ یعنی اقبال کے دماغ میں مثنوی یعنی مولانا روم کے طرز پر شاعری میں افکار اسلام کو پیش کرنا اور ایک سوتی ہوئی اُمت کو خواب سے جگانا تھا۔ چنانچہ ایک نظم "از خواب گراں خواب گراں خواب گراں خیز۔ از خواب گراں خیز" کا آخری بند بھی اسی کی نشاندہی کرتا ہے

فریاد ز افرنگ و دلآویزی افرنگ

فریاد ز شیرینی و پرویزی افرنگ

عالم ہمہ ویرانہ ز چنگیزی افرنگ

معمار حرم باز بہ تعمیر جہاں خیز

از خواب گراں خواب گراں خواب گراں خیز از خواب گراں خیز

اسی طرح ماضی کے قریبی تعلق والوں سے یہ بھی معلوم ہوا کہ علامہ موصوف کہتے تھے کہ جب میں وطنی ترانہ بنام شوالہ وغیرہ لکھ رہا تھا تو میرا خیال تھا ایک وقت آئے گا جب مجھے نوبل پرائز مل سکتا ہے لیکن جب میرے خیالات میں تبدیلی آئی اور میں نے اسلام پیش کرنے کا ارادہ کیا تو مجھے احساس ہوا کہ اب نوبل پرائز سے ہاتھ دھونا ہوگا۔ لیکن میں نے سوچا کہ اسلام کا حق میرے اوپر سب سے زیادہ ہے اور مجھے ان باتوں کی پرواہ نہ کرنا چاہئے لیکن یہ بات بھی صحیح ہو یا غلط ان کا خود کلام ظاہر کرتا ہے اس کا ایک ایک مصرعہ ایک ایک شعر ایک ایک بندش بتلاتی ہے کہ انہوں نے جو کچھ بھی کہا ہے اس کی تہ میں ہر جگہ ایک مفکر اسلام کی شان نمایاں ہے۔

اپنا تجربہ

جب میں زمیندار روزنامہ کا ایڈیٹر تھا تو ہم اور غلام رسول مہر

اکثر رات میں علامہ اقبال کی خدمت میں حاضر ہوتے تھے۔ ان کا دربارِ عام بہت رات گئے تک گرم رہتا تھا۔ ادنیٰ اور اعلیٰ کی کوئی تخصیص نہ تھی اور نہ علامہ میں کسی قسم کا احساس برتری تھا۔ میں نے خود دیکھا کہ ہائی اسکول کے لڑکے ان سے برابر کی بحث کرتے تھے۔ اور کبھی انھوں نے نہیں کہا کہ آپ لوگ یہ باتیں کیا سمجھیں۔ حالانکہ اکثر مباحث بین الاقوامی مسائل سے تعلق رکھتے تھے۔ وہاں ہم سب لوگ دیکھتے تھے کہ وہ ایک حدیث بیان کرتے تھے اور اس کی شرح میں اپنا کوئی شعر پڑھتے تھے۔ جتنی دیر صحبت رہتی تھی اسی قسم کے تذکرے ہوتے تھے اور یہ محسوس ہوتا تھا کہ ان کا پورا کلام گویا قرآن و حدیث کی شرح ہے۔ انھوں نے شعوری طور پر اسلام کی تعلیمات کو موثر سے موثر رنگ میں پیش کرنے کے لیے شاعری اختیار کی تھی اور اقبال کا کلام تعلیماتِ اسلامی کا ترجمان ہی نہیں تفسیر قرار دیا جا سکتا ہے۔ اپنے آخری زمانہ میں جب وہ زندگی سے مایوس ہوتے اس وقت جو قطعہ کہا ہے اس سے بھی اسی کی تائید ہوتی ہے۔

سرودِ رفتہ باز آید کہ ناید — نسیمے از حجاز آید کہ ناید
سر آمد روزگارے ایں فقیرے — دگر دانائے راز آید کہ ناید

اب دیکھنا ہے جو ان کے نغمے تھے انھوں نے ان کے کلام کو کیا سمجھا۔ اور یہ بھی ایک کسوٹی ہے مولانا روم کی مثنوی کے بارے میں یہ مشہور ہو گیا تھا کہ

مثنوی مولوی معنوی — ہست قرآں در زبانِ پہلوی

اسی طرح علامہ اقبال کو "ترجمانِ حقیقت" اور "مفکرِ اسلام" کے لقب بار بار دیے گئے ہیں اور وہ خود بھی فرماتے ہیں ؎

راز خدا کہ عارف و زاہد کسے نگفت
در حیرتم کہ بادہ فروش از کجا شنید
یعنی ہیں وہ رموز الٰہیہ جو عارف اور زاہد کسی نے بیان نہیں کئے وہ میں بیان کرتا ہوں اور اصل اسلام کو پیش کرتا ہوں حالانکہ میں ایک عامی اور گنہ گار ہوں۔ اور اس صف کا آدمی نہیں ہوں۔

کلام اقبال کی اندرونی شہادت

اقبال جیسے مفکر شاعر کے کلام کے مرکزی خیال کو معلوم کرنے کے لئے تین معیار ہو سکتے ہیں۔

(۱) کلام کی تاریخی نوعیت (۲) خود صاحب کلام کا ادعا اور کلام کی اندرونی شہادت۔ ہم کلام کی تاریخی نوعیت کے سلسلہ میں دیکھ چکے کہ علامہ موصوف کو خواب ہی کہ سے

روئے خود بنمود پیر حق سرشت
کو بحرف پہلوی قرآں نوشت

یعنی حضرت مولانا روم نمودار ہوئے اور علامہ موصوف کو پیغام دیا کہ جس عنوان سے مثنوی نے دنیا کو حیات کا فلسفہ بتلایا تھا امتداد زمانے سے اب وہ پر اثر نہیں رہا اس لئے اس پیام کائنات و فطرت کو اب نئے طرز و انداز سے دینے کی ضرورت ہے پس یہ فرمایا کہ

نالہ را انداز نو ایجاد کن
بزم را از ہائے و ہو آباد کن

خیز و جاں نو بدہ ہر زندہ را
از قم خود زندہ ترکن زندہ را

یعنی نالہ تو بھی ہو لیکن نئے انداز سے اسے پیش کرتا کہ بزم ہائے

و جو سے آباد ہو جائے اُٹھو اور ... میں نئی زندگی دوڑا دے اور اپنے "قُم" یعنی اُٹھو کے نعرے سے نفسوں کو ... زندہ کر دے۔

چنانچہ اس تازہ و طرزِ نو پیدا ... کے ارشاد میں علامہ موصوف میں ذوق و شوق پیدا کیا۔

زیں سخن آتش بہ پیراہن شدم　　مثلِ نے ہنگامہ آتش شدم
پر گرفتم پردہ از رازِ خودی　　وانمودم سرِّ اعجازِ خودی

یعنی اس کلام سے میرے بدن میں آگ لگ گئی اور میں مثلِ نے ہنگامہ پرداز ہو کر رازِ خودی کو آشکارا کرنے کے لئے آمادہ ہو گیا اور سرِّ اعجازِ خودی کو نمایاں کیا اور وہ رازِ خودی سے پردہ اٹھانے اور سرِّ اعجازِ خودی ظاہر کرنے کے لئے آمادہ ہوئے اور اس طرح "اسرارِ خودی" اور اس کے بعد تصانیف کا وجود ہوا۔

خود صاحبِ کلام کے ادعا پر بھی بحث ہو چکی اور یہ ظاہر کیا جا چکا ہے وہ بار بار اپنے آپ کو اسلام کا داعی قرار دیتا ہے۔ اب آیئے کلام کی اندرونی شہادت کا جائزہ لیں۔

اسرارِ خودی

نیت

وہ کیا چیز تھی جس کے پیش کرنے کا ارادہ اقبال نے کیا۔ وہ انسا کا پیام اور ملتِ بیضا کی تعلیم تھی چند الفاظ میں شروع ہی میں دونوں کی یکسانیت کو واضح کر دیا ہے ؎

بہرِ انساں چشمِ ما شبہا گریست　　تا دریدم پردۂ اسرارِ زیست
از درونِ کارگاہِ ممکنات　　برکشیدم سرِّ تقویمِ حیات

من کہ ایں شب را چو مہ آراستم — گرد پائے ملتِ بیضاستم

ملتے در باغ و راغ آوازہ اش — آتشِ دلہا سرودِ تازہ اش

یعنی انسانیت کے درد و سوز نے غور و فکر پر مجبور کیا۔ غور و فکر نے "اسرارِ زلیت" کو نمایاں کیا اور وہ کیا تھا۔ ملتِ بیضا کی تعلیم تھی۔ اس کے بعد خودی کا فلسفہ پیش کرنے کے بعد کہا کہ خودی عشق و محبت سے مستحکم ہوتی ہے اور اس کی مثال رومی و تبریز سے لی۔ ملاحظہ ہو۔

عاشقی آموز و محبوبے طلب — چشمِ نوحے قلبِ ایوبے طلب

کیمیا پیدا کن از مشتِ گلے — بوسہ زن بر آستانِ کاملے

شمعِ خود را ہمچو رومیؒ بر فروز — روم را در آتشِ تبریز سوز

یعنی خودی کو مستحکم کرنے کے لئے عاشقی سیکھ اور کسی محبوب کی تلاش کر کسی نوح کی آنکھ اور کسی ایوب کا دل تلاش کر اور کسی کامل کے آستانہ پر بوسہ دے کر اپنی مشتِ گل کو کیمیا بنا اور اپنی شمع کو رومی کی طرح خود روشن کر اور روم میں آتشِ تبریز سے سوز پیدا کر اور اس کے بعد فوراً وہ معرکۃ الآرا نعت کہی ہے جس کا غلغلہ آج بھی قائم ہے یعنی۔

۱۔ در دلِ مسلم مقامِ مصطفیٰؐ است — آبروئے ما ز نامِ مصطفیٰؐ است

۲۔ طور موجے از غبارِ خانہ اش — کعبہ را بیت الحرم کاشانہ اش

۳۔ بوریا ممنونِ خوابِ راحتش — تاجِ کسریٰ زیرِ پائے امتش

۴۔ در شبستانِ حرا خلوت گزید — قوم و آئین و حکومت آفرید

۵۔ ماند شبہا چشمِ او محرومِ نوم — تا بہ تختِ خسروی خوابید قوم

۶۔ در جہاں آئینِ نو آغاز کرد — مسندِ اقوامِ پیشیں در نورد

۷۔ امتیازاتِ نسب را پاک سوخت — آتشِ او ایں خس و خاشاک سوخت

۸- من چہ گویم از تولاش کہ چیست | خشک چوبے در فراقِ او گریست

۹- پیکرم را آفرید آئینہ اش | صبحِ من از آفتابِ سینہ اش

۱۰- آں کہ بر اعدا درِ رحمت کشاد | مکہ را پیغامِ لاتثریب داد

اور پیام یہ ہے کہ

فکرے پیدا کن از سلطانِ عشق | جلوہ گر شو بر سرِ فارانِ عشق

تا خدائے کعبہ بنوازد ترا | شرحِ انی جاعلٌ سازد ترا

اسی جگہ ایک واقعہ کا بھی تذکرہ کیا ہے اور وہ یہ ہے کہ جب حاتم طائی کے خاندان کی ایک لڑکی نبی پاک صلعم کے سامنے پیش کی گئی تو اس کا حال یہ کہ اس کے پیروں میں زنجیر تھی اور وہ بے پردہ تھی۔ آپ نے جب اس لڑکی کو بے پردہ دیکھا تو وہ خود اپنی چادر اسکو دیدی ؎

دخترک را چوں نبی بے پردہ دید | چادرِ خود پیشِ روئے او کشید

اب اقبال کے دل میں سوز پیدا ہوتا ہے وہ خودی کو عشقِ رسول میں مستحکم کرکے ذہنی انقلاب کا پیغام دے چکا اور اس واقعہ کے تذکرے کے بعد اسے عالمِ اسلام کی کمزوری و بے کسی یاد آتی ہے اور تڑپ کر دربارِ رسالت میں فریاد کرتا ہے ؎

ما ازاں خاتونِ طے عریاں تریم
پیشِ اقوامِ جہاں بے چادریم

یعنی ہم لوگ اس طے کی لڑکی سے بھی زیادہ ننگے ہیں اور دنیا کی قوموں کے سامنے آج بلا چادر کے ہیں۔ لیکن وہ مایوسی کا پیغامبر نہیں ہے اور دین اور دنیا دونوں کے لیے رحمۃ العالمین صلعم کے دامن میں پناہ لیتا ہے ؎

روزِ محشر اعتبارِ ماست او | در جہاں ہم پردہ دارِ ماست او

خودی کے دیگر لوازمات بیان کرنے کے بعد اس کے تین مراحل بیان کئے ہیں۔ اوّل اطاعت۔ دوم ضبطِ نفس۔ سوم نیابتِ الٰہی، جس کے آخر میں مجبوری میں فریاد کر کے جنابِ رسالت مآب صلعم کو دوبارہ تشریف لانے کی عرض داشت پیش کی ہے۔ یہ اگرچہ نا ممکن ہے لیکن جذبات کی شدت میں انسان منطق بھول جایا کرتا ہے۔ اسی سلسلے کا اقبال کا وہ شعر بھی ہے جس میں اللہ تعالیٰ کو لباسِ مجاز میں آنے کی دعوت دی ہے ؎

کبھی اے حقیقتِ منتظر نظر آ لباسِ مجاز میں
کہ ہزاروں سجدے تڑپ رہے ہیں میری جبینِ نیاز میں

یہ کچھ اقبال کے لئے انوکھی چیز نہیں۔ ملا جامی نے بھی جنونِ عشق میں ایسے اشعار کہے ہیں۔

مولانا ظفر علی خاں کا بھی ایک قطعہ اسی رنگ کا ہے ؎

قولِ اکبر ہے کہ خوں ریزی مٹانے کے لئے — حضرتِ عیسیٰ کو دنیا میں بلانا چاہئے
امن کے شہزادے کا لازم ہے دنیا میں نزول — ظالموں پر بس یہی نزلہ گرانا چاہئے
بندہ کہتا ہے قیامت کی ابھی ساعت ہے دور — ہم کو کچھ اور یوں ہی گڑگڑانا چاہئے

وہ جو یثرب میں پڑا سوتا ہے میٹھی نیند اسے
مسلمِ بے کس کے نالوں سے جگانا چاہئے

چنانچہ اقبال بھی بڑے سوز سے اس طرح نعرۂ الغیاث بلند کرتا ہے

اے سوارِ اشہبِ دوراں بیا — اے فروغِ دیدۂ امکاں بیا
خیز و قانونِ اخوت ساز دہ — جامِ صہبائے محبت باز دہ
باز در عالم بیار ایامِ صلح — جنگجویاں را بدہ پیغامِ صلح
نوعِ انساں مزرع و تو حاصلی — کاروانِ زندگی را منزلی

سجدہ ہائے طفلک برنا و پیر — از جبینِ شرمسارِ ما گیر
از وجودِ تو سر افرازیم ما
پس بہ سوزِ این جہاں سازیم ما

یعنی اے سوارِ اشہب دوراں اور اے فروغِ دیدۂ امکاں آئیے اور اُٹھیے اور اخوت کا قانون جاری کیجیے اور پھر بادہ محبت کا جام دیجیے۔ دنیا میں پھر امن قائم کیجیے اور لڑنے والوں کو صلح کا پیغام دیجیے تمام نوعِ انسان کھیتی ہیں اور آپ حاصل ہیں اور زندگی کے قافلہ کی آپ ہی منزل ہیں۔ ہمارے نیاز کو قبول کیجیے کیونکہ آپ ہی سے ہمیں سر افرازی حاصل ہے۔ شاعرانہ تمثیل سے علیحدہ ہو کر اس کے معنی سادہ لفظوں میں یہ ہوئے کہ دنیا کی نجات پیغامِ رسالت میں ہے۔ بعض لوگوں نے "سوارِ اشہب دوراں" سے مراد ایک مردِ کامل لیا ہے جس کا اقبال کو انتظار ہے۔ لیکن مجھے اس سے اتفاق نہیں ہے یہ اشعار مرحلہ سوئم "نیابتِ الٰہی" کے سلسلہ میں آئے ہیں۔ اقبال نے تربیتِ خودی کے تین مراحل قرار دیئے ہیں۔ مرحلہ اول اطاعت، مرحلہ دوئم ضبطِ نفس اور مرحلہ سوئم نیابتِ الٰہی۔ اس میں شک نہیں کہ وہ خودی کی پرورش اور نمو سے ہر مومن کو نائبِ الٰہی اور خلیفۃ اللہ بنانا چاہتا ہے۔ لیکن نیابتِ الٰہی کا تذکرہ کرتے وقت وہ کاروانِ سالارِ نائبانِ الٰہی علیہ السلام کو کیسے فراموش کر سکتا۔ وہ جس کی ہر رگِ جاں میں "عشقِ رسول" کا نغمہ سمایا ہوا تھا۔ چنانچہ کلام کی اندرونی شہادت بھی اسی جانب اشارہ کرتی ہے۔

نوعِ انساں را بشیر و ہم نذیر — ہم سپاہی ہم سپہ گر ہم امیر

یعنی بنی نوعِ انسان کے لیے بشیر بھی ہے اور نذیر بھی ہے خود سپاہی بھی ہے اور سپہ گر بھی اور امیر بھی اور سب باتیں در کنار "بشیر و نذیر"

صرف نواتِ رسولِ پاک صلعم کسی دوسرے کے لئے یہ الفاظ استعمال نہیں ہو سکتے۔ اقبال بارگاہِ الٰہی میں تو بڑا گستاخ ہے لیکن بارگاہِ رسالت میں بے انتہا مودب رہتا ہے۔ اس لئے نا ممکن ہے کہ وہ کسی دوسرے کو بشیر و نذیر کہہ سکے یا کسی بشیر و نذیر کا منتظر ہو۔ نبی بعد ہی پر اس کا مکمل عقیدہ ہے۔ کہیں

مدعائے علم الاسما استے | سر سبحان الذی اسرا استے

یعنی حضرت آدم علیہ السلام کو جو علم اسما کی تعلیم دی گئی تھی وہ اس کا مدعا ہے اور سبحان الذی اسریٰ بعبدہٖ و معراج کا راز ہے۔ یہ دونوں باتیں بھی صرف پیغمبرِ اسلام ہی میں جمع ہو سکتی ہیں اور آپ ہی کے لئے کہی جا سکتی ہیں۔

جلوہ ہا خیزد ز نقشِ پائے او | صد کلیم آوارۂ سینائے او

اس کے نقشِ پا سے جلوے اٹھتے ہیں اور ان کے سینا میں سینکڑوں کلیم آوارہ پھرتے ہیں۔

زندگی را می دہد تفسیرِ نو | می دہد ایں خواب را تعبیرِ نو

زندگی کو ایک نئی تفسیر دینے والا اور زندگی کے خواب کی جدید تعبیر کرنے والا۔ یہ سب باتیں نبی علیہ السلام والصلوٰۃ والتسلیم ہی کے لئے مخصوص ہیں۔

رموزِ بیخودی

رموزِ بیخودی میں انسانی خودی کو نظمِ اجتماعی کا محتاج بتلایا ہے۔ اور فرد و ملت میں رابطہ پیدا کرنے کی دعوت دی ہے۔ اسی سے وہ

نیابت الہی یا خلیفۃ اللہ ہونے کا حقدار ہوتا ہے اور اس کی تربیت بدین صرف ذریعہ نبوت ممکن ہے کیونکہ نبوت ہی "نوامیس الہیہ" اف نوں تک پہنچا سکتی ہے۔ اور بلا نوامیس الہیہ کی رہنمائی و رہبری کے عقل انسانی اس کی ہدایت سے قاصر ہے۔ عقل انسانی سے جس سوسائٹی یا اجتماعی زندگی کی تعمیر ہوگی وہ ہمیشہ ناقص رہے گی۔ اس اجمال کی تفصیل ارکان اساسی ملیہ اسلامیہ بیان کرکے کی ہے اور ان کو دو حصوں میں تقسیم کیا ہے۔ (۱) توحید۔ (۲) رسالت یعنی کلمہ طیبہ پر ملت کی اساس قائم کی ہے۔ باقیں وہی ہیں۔ طرز ادا نرالی ہے اور خاتمہ عرض حال مصنف بحضور رحمۃ للعالمین پر ہے۔ جو تمناؤں۔ آرزوؤں۔ ذوق و شوق اپنی بے مائیگی اور عجز و انکسار سے سراسر لبریز ہے۔

جو مضامین "اسرار خودی" اور "رموز بیخودی" میں بیان کئے گئے ہیں ان کے عنوانات سے بھی اقبال کے پیام کی مکمل وضاحت ہوتی ہے۔ اس لئے ان کا تذکرہ بھی مناسب اور ضروری ہے۔ وہ حسب ذیل ہیں۔

۱۔ در شرح اسرار اسمار حضرت علی مرتضیٰؓ

۲۔ مقصد حیات مسلم اعلاء کلمۃ اللہ است و جہاد اگر محرک جوع الارض باشد در مذہب اسلام حرام است۔

یعنی مسلم کی زندگی کا مقصد اعلاء کلمۃ اللہ ہے اور جہاد اگر جوع الارض کی محرک ہو تو مذہب اسلام میں حرام ہے۔

اس کا پہلا شعر ہے۔

اے ترا حق خاتم اقوام کرد   بر تو ہر آغاز را انجام کرد

۲۔ مقصد ریاست محمدیہؐ تشکیل و تاسیس حریت و مساوات و اخوت بنی آدم است۔

۳۔ حریت اسلام و سر حادثہ کربلا۔

۵۔ وطن اساسی ملت نیست۔

۶۔ ملت محمدیہؐ نیابت مکانی ندارد۔

۷۔ ملت محمدیہؐ نیابت زمانی ندارد کہ دوام این ملت شریفہ بوجود است

۸۔ نظام ملت محمدیہؐ جز از آئین صورت نہ بندد و آئین ملت محمدیہؐ قرآن است۔

۹۔ پختگی سیرۃ ملیہ از اتباع آئین الہیہ است

۱۰۔ حسن سیرۃ محمدیہؐ از تادب بہ آداب محمدیہؐ است

۱۱۔ مرکز ملت اسلامیہ بیت الحرام است۔

۱۲۔ جمعیۃ حقیقی از محکم گرفتن نصب العین ملیہ است و نصب العین ملت محمدیہؐ حفظ و نشر توحید است۔

۱۳۔ توسیع حیات ملیہ از تسخیر قوائے نظام عالم است۔

۱۴۔ کمال حیات ملیہ این است کہ ملت مثل فرد احساس خودی پیدا کند و تولید و تکمیل این احساس از اموست است و حفظ و احترام اموست اصل اسلام است۔

(۵) تفسیر قل ھو اللہ۔

خلاصہ پیام اقبال

اس طرح پیام اقبال کا خلاصہ جو بلا کسی ابہام اشارے یا رمز کے صاف صاف پیش کیا گیا ہے حسب ذیل ہے جو بعینہٖ تعلیم اسلام ہے۔

۱۔ وجود واجب الوجود کا اقرار اور توحید باری تعالیٰ پر مستحکم عقیدہ
۲۔ انسان کے اپنے وجود کا ایک الگ ہستی کی حیثیت سے احساس و ادراک و یقین۔
۳۔ تزکیہ اور تہذیب و تزئین نفس کے لئے اور عالم میں خیر کی اشاعت و ترویج کے لئے عقل پر بھروسہ نہ کرنا بلکہ نوامیس الٰہیہ کا پابند ہونا۔
۴۔ نوامیس الٰہیہ بذریعہ وحی ربانی آتے ہیں۔ اور آخری احکام بذریعہ وحی محمد الرسول اللہ صلعم پر آئے اور آپ افضل البشر تھے۔ اور آپ کی اتباع میں انسان کی انفرادی و روحانی و جسمانی آراستگی اور عالم کی فلاح مضمر ہے۔
۵۔ ہر انسان کو مرد کامل یا مرد مومن بننا چاہئے۔ اقبال کی زبان میں مرد کامل اور مرد مومن ایک ہی معنی کے دو الفاظ ہیں اور ہر مرد مومن کا اولین فرض اعلاء کلمۃ اللہ ہے۔
۶۔ دنیا سے باطل کو مٹانے اور حق کو قائم کرنے کے لئے جہاد بالسیف ہر مومن کے لئے جائز ہے۔ لیکن اس کا محرک جوع الارض ہو تو وہ اسلام میں حرام ہے۔ اس میں اپنی کوئی غرض ذاتی یا قومی شامل نہ ہونا چاہئے۔ اور صرف رضائے حق مطلوب ہونا چاہئے۔

اس موضوع پر چونکہ اسلام کے بارے میں سخت غلط فہمی پھیلی ہوئی ہے۔ اس لئے اشارتاً اس کی تصریح کر دینا مناسب معلوم ہوتا ہے۔ عیسائی مشنریوں نے اسلام کو ایک خونخوار مذہب کی حیثیت سے پیش کیا ہے اور اس کے جواب میں دانشوران اسلام نے

بڑی بحثیں کی ہیں۔ لیکن اسلام کا بنیادی عقیدہ یہ ہے کہ تمام نوع انسان عیال اللہ یعنی ایک گھرانہ ہیں اور مسلمان حزب اللہ ہیں یعنی اللہ کے لیے یعنی حق کے قائم کرنے کے لئے جہاں کہیں ضرورت ہو اپنے جان و مال کی قربانی پیش کریں اور اسی کا نام جہاد ہے۔ دنیوی جنگ میں خون ریزی کرنا کسی طرح اسلام نے جائز قرار نہیں دیا اور جہاد کے شرائط مذکور ہیں۔ اسلام کی تعلیم ہے کہ اگر کسی شخص نے ایک انسان کو قتل کیا تو گویا اس نے تمام بنی نوع انسان کو قتل کیا اور اگر کسی نے ایک انسان کی جان بچائی تو گویا بنی نوع انسان کی جان بچائی۔ ایسی صورت میں کہاں ممکن ہے کہ اسلام قتل و خوں ریزی کی اجازت دے۔ یہ تعلیم عقیدتمندوں کے لئے اس درجہ عام ہے کہ اسے ہر ایک سمجھتا اور جانتا ہے۔ پرانی باتوں سے درگذر کر کے میں بالکل اس زمانہ کی مثال دیتا ہوں۔ محمد علی کلے مشہور رستم عالم مکہ باز کو جب جبری بھرتی کے ذریعہ وہ نام میں جا کر لڑنے کا حکم ہوا تو اس نے انکار کیا۔ یہ امریکہ کا ایک نو مسلم حبشی ہے پہلے اس کا نام کیشیس کلے تھا۔ اس نے عالم میں مکہ بازی کا ریکارڈ قائم کیا اور بڑے بڑے پہلوانوں کو منٹوں میں زمین دوز کر دیا۔ عالمی چیمپین کی حیثیت سے اس کو ایک معتدبہ رقم ملتی تھی اور گاہے گاہے مکہ بازی میں حصہ لینے کے سلسلے میں لاکھوں ڈالر الگ ملتے تھے۔ اس انکار کی بنا پر اس سے رستم عالم کا خطاب چھین لیا گیا۔ اسے مکہ بازی کے کھیل میں اترنے سے ممنوع کر دیا گیا اور اس پر تیس ہزار ڈالر جرمانہ کی سزا کی گئی جس کی اپیل دائر ہوئی لیکن یہ سب قربانیاں اس نے دیں اور جادۂ حق سے انحراف نہیں کیا۔ اگر کوئی گنجائش ہوتی تو ایسا کرنے کی کیا ضرورت تھی اسی طرح ایک جگہ وہ گیا۔ افباری نمائندوں نے اسے گھیر لیا اور کیشیس کلے کے

نام سے پکار کر سوال کرنے لگے تو وہ خاموش رہا اور کوئی جواب نہیں دیا۔ جب محمد علی کلے کے نام سے ایک نمائندے نے پکارا تو وہ بولا اور اس سوال کے جواب میں کہ اس کا کیا مذہب ہے اس نے کہا کہ میرا مذہب اسلام ہے اور کیسی مختصر اور جامع توضیح اسلام کی کی کہا کہ اس کا مطلب یہ ہے کہ میں نے اپنی رضا کو رضائے الٰہی میں گم کر دیا ہے۔ یہ ہے وہ بے غل وغش اسلام جو سرچشمہ کے صاف پانی کی طرح نمایاں ہے۔ اگر مومن کی حیثیت یہ ہے کہ وہ اپنی رضا کو رضائے الٰہی میں گم کر دے تو پھر حرص وہوس کی گنجائش ہی کہاں باقی رہتی ہے اور یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ ایک مومن بجز رضائے الٰہی کے اور کسی غرض کے لئے تشدد کا استعمال کرے۔ اسلام نے بیشک تشدد کو جائز کیا ہے لیکن اس لئے ایک مجبوری بھی ظاہر کر دی ہے۔ قرآن نے قتل کو ایک بہت ہی قبیح چیز قرار دیا ہے۔ لیکن چونکہ فتنہ و فساد قتل سے بھی زیادہ قبیح اور معیوب ہیں لہٰذا اسے مٹانے کے لئے تشدد جائز کیا گیا ہے۔ اقبال اسی تصور کا حامی ہے۔

یہ اقبال نے اس تصور کی بھی تردید کی ہے کہ جب وحی آنا بند ہو گئی اور نبی علیہ السلام نے اس دنیا سے ظاہری پردہ فرمایا تو قرآن کے وارث علماء ہو گئے وہ پوری ملت اسلامیہ کو خاتم النبیین کا وارث قرار دیتا ہے ؎

اے ترا حق خاتم اقوام کرد | بر تو ہر آغاز را انجام کرد
طرح عشق انداز اندر جان خویش | تازہ کن با مصطفےٰ پیمان خویش

یعنی اے ملت اسلامیہ تجھے حق تعالیٰ نے خاتم اقوام بنایا اور ہر آغاز کا انجام تیرے اوپر ہوا۔ اپنی جان میں طرح عشق کی بنیاد ڈالی اور جناب سرور کائنات محمد مصطفےٰ صلعم سے جو پیمان کیا تھا اسے تازہ کر۔ لب لباب یہ ہے کہ تو ہی نبی علیہ السلام کی وارث ہے۔ وہ ہر مسلمان کو اس وراثت

کے فرائض انجام دینے پر اکسانا ہے۔ وہ فرد اور ملت کا ایک ربط قائم کرتا ہے۔ اور صرف فرد کو صوفیائے کرام کے مسلک کے خلاف حقیقی اہمیت نہیں دیتا۔ صوفیائے کرام فرد کی تہذیب نفس سے آگے نہیں جاتے۔ وہ ملت کی بھی اسی نہج پر تعمیر کرتا ہے تاکہ عالم کو سنوارا جاسکے اور فرد کو ملت سے الگ دیکھ ہی نہیں سکتا۔

فرد قائم ربط ملت سے ہے تنہا کچھ نہیں
موج ہے دریا میں اور بیرون دریا کچھ نہیں

اس کا مطلب یہ ہرگز نہ لینا چاہیے کہ وہ مارکسی عقیدے کے مطابق فرد کے تشخص و اہمیت ہی کا قائل نہیں ہے مگر اس پر آگے چل کر مفصل بحث ہو گی۔

۵۔ آج جارحانہ وطن پرستی نے اقوام عالم کو ٹکڑوں اور ٹولیوں میں تقسیم کر دیا ہے۔ اور ہر مضبوط کمزور کو ہضم کرنے کی فکر میں لگا ہوا ہے۔ بے ایمانی دروغ بافی ستم پروری ظلم تشدد کچھ بھی ہو وطن کے لئے جائز ہے۔ وارن ہیسٹنگز گورنر جنرل ہندوستان نے بنارس کے راجہ چیت سنگھ پر ظلم ڈھا کر اس سے رقم وافر وصول کی بیگمات اودھ کو گھیرے میں لے آب و دانہ بند کر کے ان کے زیورات انھیں بیگمات کے لڑکوں کو چھنوائے کیوں؟ اپنے لئے نہیں بلکہ ایسٹ انڈیا کمپنی کا خزانہ خالی تھا۔ اسے بھرنے کے لئے۔ پارلیمنٹ کے ممبر برک نے برطانوی پارلیمنٹ کے اندر اپنی شہرہ آفاق تقریر وارن ہیسٹنگز پر مقدمہ چلانے کی تجویز پیش کی۔ وزیر اعظم ولیم پٹ نے تجویز منظور کر لی اور عدالت میں مقدمہ چلا۔ اس زمانے کے بہترین مقرر نے جو بیرسٹر بھی تھا ثبوت کی جانب سے پیروی کی۔ پہلے اس نے ماں

کے درجے کو جتلایا اُسے پڑھئے تو معلوم ہوتا ہے کہ ہم عرشِ اعلیٰ کی جانب پرواز کر رہے ہیں۔ پھر کہا کہ اگر کوئی نالائق بیٹا ایسا ہو کہ ماں کو ستائے تو اسے کیا سمجھا جائے گا۔ عدالت کے کمرے میں ہر شخص پر ایک سکتہ طاری تھا اور کوئی یہ یقین کرنے کے لئے تیار نہ تھا کہ کوئی ایسا نالائق فرزند بھی ہو سکتا ہے۔ تب اس نے کہا کہ ماں بھی محبت کرنے والی اور بیٹا بھی اطاعت شعار وہ انسان کیسا ہوگا کہ بیٹے کو مجبور کرے کہ وہ ماں پر ستم ڈھائے اور اس کے زیورات چھینے۔ اس پر عورتیں چیخ چیخ کر بیہوش ہو گئیں اور روایت ہے کہ خود وارن ہیسٹنگز زیر لب بڑبڑایا کہ "میں اس روئے زمین پر سب سے بڑا مجرم ہوں" لیکن عدالت نے وارن ہیسٹنگز کو صاف بری کر دیا۔ اور سات سال جو مقدمہ چلا تھا۔ اس کی پوری تنخواہ بھی دے دی اور بعد کو اسے لارڈ کا بھی خطاب ملا۔ پھر کس لئے؟

کیا الزامات ثابت نہ ہو سکے، کیا واقعات غلط دریافت ہوئے جی نہیں؟ عدالت نے کہا ملزم پر کل الزامات ثابت ہیں لیکن اس کو بری اس لئے کیا کہ اس نے جو کچھ کیا اپنے لئے نہیں بلکہ قوم کے لئے کیا۔ یعنی قوم کے لئے بدترین جرائم بھی جائز ہیں۔ میں نے اس واقعہ کو کسی قدر وضاحت سے اس لئے بیان کیا ہے کہ بے حیائی اور ڈھٹائی کے ساتھ وطن کے لئے ہر برائی اور بے ایمانی اور ستم پروری کو جائز قرار دینے کی اس سے بدتر مثال شاید ہی مل سکے۔ اس کے مقابلے میں تاریخ اسلام کا ایک واقعہ کتنا سبق آموز ہے جسے علامہ شبلی نعمانی نے نظم بھی کیا ہے۔ انگریز مورخین بڑی مدح سرائی کے ساتھ لکھتے ہیں کہ جس سرعت کے ساتھ حضرت عمرو بن العاص نے خلیفہ دوئم حضرت عمرؓ کے زمانے میں صحرائے سینا کو عبور

کر کے مصر کو فتح کیا۔ اس کی مثال نپولین کے سوا اور کسی جنرل کی زندگی میں نہیں ملتی۔ فتح کے بعد انھی کو مصر کا گورنر مقرر کر دیا گیا۔ ان کی گورنری کے زمانے میں ایک دن یہ ہوا کہ ایک قبطی اور ان کے لڑکے نے گھوڑے دوڑائے اور جب قبطی کا گھوڑا آگے نکل گیا تو حضرت عمرو بن العاص کے صاحبزادے نے اسے کوڑوں سے پیٹا۔ قبطی سیدھا دربارِ خلافت گیا اور فریاد کی اور یہ بھی کہا کہ فرق صرف اتنا ہے کہ وہ بڑے باپ کا بیٹا ہے۔ فوراً حضرت عمرؓ نے آسمان کی طرف نگاہ اٹھائی اور کہا کہ اے خدا گواہ رہنا کہ میں اس ظلم سے بری ہوں۔ اور پھر باپ بیٹے دونوں کو طلب کر کے مجلس شوریٰ کے سامنے قبطی کو کوڑا دے دیا۔ اور اس نے حضرت عمرو بن العاص کے بیٹے کو پیٹا۔ حضرت عمرؓ کوڑے کی ہر ضرب پر فرماتے تھے اور کہتے تھے کہ ہاں لگے کوڑا بڑے باپ کا بیٹا ہے۔ جب صاحبزادے پٹ چکے تو حضرت عمرؓ نے قبطی سے کہا کہ باپ کی بھی کوڑے سے خبر لے مگر اس نے انکار کیا۔ یعنی اگر وہ انکار نہ کرتا تو خود حضرت عمرو بن العاص ایک غیر مسلم قبطی کے ہاتھوں صرف اس جرم میں کہ ان کی گورنری میں ایسا واقعہ کیوں پیش آیا۔ کوڑوں سے پیٹے جاتے۔ آخر میں خلیفۂ دوم نے حضرت عمرو بن العاص کو مخاطب کر کے وہ کلاسکی جملہ کہا ہے کہ جو کئی صدیوں کے بعد فلسفۂ سیاست کی بنیاد بنا۔ فرمایا افسوس تم کن لوگوں کو طوقِ غلامی پہنا رہے ہو جن کی ماؤں نے تو ان کو آزاد جنا تھا۔

اقبال اگرچہ اصلاحِ فساد اور قیامِ حق کے لئے جہاد کو جائز سمجھتا ہے اور تاکہ ملتِ اسلامیہ اس فریضے سے غافل نہ ہو جائے اس کو طرح طرح سے بڑے زور دار اور پرجوش لفظوں میں ذہن نشین کرتا ہے لیکن اس

کی تعلیم ہے کہ نبی آخر الزماں ؐ کی رسالت کا مقصد ہی تشکیل دنیا میں
حریت و مساوات و اخوت بنی آدم تھا ۔ اور یہی ہے خیال اقبال کا وہ فلسفہ
جو اسلام کا ایک مسلّمہ بنیادی عقیدہ ہے۔ اس نے وطن کو اساس
ملت قرار دینے کا منکر ہے وہ کہتا ہے کہ انسان کو وطنی نہیں عالمی
بننا چاہیے۔ اسے تمام عالم کو اپنا وطن تصور کرنا چاہیے۔
اور قیود مکانی سے آزاد ہونا چاہیے۔

یہ ہندی وہ خراسانی یہ ایرانی وہ افغانی
تو اے شرمندۂ ساحل اچھل کر بیکراں ہو جا
غبار آلودۂ رنگ و نسب ہیں بال و پر تیرے
تو اے مرغ حرم اڑنے سے پہلے پرفشاں ہو جا
خودی میں ڈوب جا غافل یہ سرِّ زندگانی ہے
نکل کر حلقۂ شام و سحر سے جاوداں ہو جا

لیکن یہ قیود مکانی سے آزادی ایک اصول کے ماتحت ہوگی ۔ ملت اسلامیہ کا تعلق اگرچہ بنی نوع انسانی سے محبت اور صلح و آشتی کا ہوگا لیکن ملتِ اسلامیہ فرد اور ملت کی خودی سے مزین ہو کر عالم میں کار فرما ہوگی ۔ چنانچہ اس کے لئے ایک آئین کی ضرورت ہے وہ آئین کیا ہوگا؟ اسے عقل ترتیب نہیں دے سکتی بلکہ خود خالق موجودات کا فرمان ہوگا جسے جا بجا ناموس الٰہیہ کہا گیا ہے اور وہ ہے قرآن یعنی ملت اسلامیہ قرآن کا آئین بن کر عالم میں جلوہ گر ہوگی اور انسان کی بلندی و رفعت و صحیح کارکردگی کا ایک نمونہ پیش کرے گی ۔

آج یہ ایک خواب معلوم ہوگا جب اسلامی مملکتیں ایک دوسرے سے

رشک و رقابت میں مبتلا ہیں۔ اور خود جزیرۃ العرب ٹکڑے ٹکڑے ہو گیا ہے اور بیرونی خطرے کے مقابلے میں متحد نہیں ہو سکتا ہے لیکن اقبال نے جس دور میں اپنا نعرہ سنایا اس وقت اگرچہ ضعف و انحطاط حد درجہ سما گیا تھا لیکن "مرد بیمار" کے جانبر ہونے کی امید بھی باقی تھی۔ اور اقبال اتحاد اسلام کے نعرے کا زبردست داعی محض سیاست کے اعتبار سے نہیں ہے بلکہ وہ اصولاً اس کا معتقد ہے ؎

ایک ہوں مسلم حرم کی پاسبانی کے لئے
نیل کے ساحل سے لے کر تابخاکِ کاشغر
تا خلافت کی بنا دنیا میں پھر ہو استوار
لا کہیں سے ڈھونڈ کر اسلاف کا قلب و جگر

وہ مایوس ہونا تو جانتا ہی نہ تھا۔ چنانچہ سخت بحران کے زمانہ میں طلوع اسلام کی نظم لکھی ہے اور شروع سے آخر تک امید کا پیمانہ لبریز رہا ہے قطعہ

نالۂ صیاد سے ہوں گے نوا ساماں طیور
خونِ گلچیں سے کلی رنگیں قبا ہو جائیگی
آنکھ جو کچھ دیکھتی ہے لب پہ آسکتا نہیں
محوِ حیرت ہوں کہ دنیا کیا سے کیا ہو جائیگی
دیکھ لوگے سطوتِ رفتارِ دریا کا مآل
موجِ مضطر ہی اسے زنجیر پا ہو جائے گی
شب گریزاں ہو گی آخر جلوۂ خورشید سے
یہ چمن معمور ہوگا نغمۂ توحید سے

عشق کو فریاد لازم تھی سو وہ بھی ہو چکی
اب ذرا دل تھام کر فریاد کی تاثیر دیکھ
تو نے دیکھا سطوتِ رفتارِ دریا کا مآل
موجِ مضطر کس طرح بنتی ہے اب زنجیر دیکھ
عام حریت کا جو دیکھا تھا خواب اسلام نے
اے مسلماں آج تو اس خواب کی تعبیر دیکھ
کھول کر آنکھیں مرے آئینۂ گفتار میں
آنے والے دور کی دھندلی سی اک تصویر دیکھ
آزمودہ فتنہ ہے اک اور بھی گردوں کے پاس
سامنے تقدیر کے رسوائیِ تدبیر دیکھ
مسلم استی سینہ را از آرزو آباد دار
ہر زماں پیشِ نظر لا یخلف المیعاد دار

شفق نہیں مغربی افق پہ یہ جوئے خوں ہے یہ جوئے خوں ہے
طلوعِ فردا کا منتظر رہ کہ دوش و امروز ہے افسانہ
ہوائیں ان کی، فضائیں ان کی، سمندر ان کے، جہاز ان کے
گرہ بھنور کی کھلے تو کیونکر، بھنور ہے تقدیر کا بہانہ
جہانِ نو ہو رہا ہے پیدا، وہ عالمِ پیر مر رہا ہے
جسے فرنگی نے بنا دیا ہے قمار خانہ
ہوا ہے گو تند و تیز لیکن چراغ اپنا جلا رہا ہے
وہ مردِ درویش جس کو حق نے دیے ہیں اندازِ خسروانہ

لیکن تحریک اتحاد اسلام کے تاریخی پس منظر سے قطع نظر اصولی طور پر اقبال ملت اسلامیہ عالم کی انفرادی و اجتماعی خودی کی بنیاد پر تعمیر کی تعلیم دیتا ہے اور اس کے لئے کوئی وقتی و زمانی مسئلہ حل طلب نہ ہونا چاہئے

۹۔ ملت اسلامیہ کا نصب العین اقبال کی نگاہ میں حفظ و نشر توحید ہے اور یہی عقیدہ ہے جو اسلام کا سنگ بنیاد ہے۔ اسلام کی تعلیم یہ ہے کہ شروع زمانے سے ہر ملک اور ہر خطہ میں تمام عالم کے اندر انبیائے کرام اللہ تعالیٰ کی طرف سے مبعوث ہوئے اور ان کے بعثت کی غرض اولین توحید کی تعلیم و تبلیغ تھی۔ چنانچہ مقامی اور زمانی احکام بذریعہ الہام آتے رہے PARTIAL AND LOCAL REVELATION اور آخر میں خاتم النبیین محمد الرسول اللہ صلعم مبعوث ہوئے جن کی تعلیم قیامت تک کے لئے اور مکمل تھی اسی کو وہ اپنی شاعرانہ اور فلسفیانہ زبان میں طرح طرح سے بیان کرتا ہے تاکہ ذہن نشین ہو جائے۔ چنانچہ پیغمبر اسلام چونکہ آخری اور کامل احکام نبی تھے اور آپ کے بعد دین کے مکمل ہونے کی وجہ سے الہام تا قیامت بند ہو گیا اس لئے آپ اب ہمیشہ کے لئے پوری امت کے لئے اسوۂ حسنہ اور نمونۂ عمل ہیں اور آپ ہی کی اتباع میں فرد کی تہذیب اور ملت کے سنوارنے کا کام انجام پا سکتا ہے ؎

بہ مصطفےٰ برساں خویش را کہ دیں ہمہ اوست
اگر بہ او نہ رسیدی تمام بولہبی است

کس قدر صاف اور واضح طور پر کہتا ہے کہ عشق و اتباع رسول ہی میں تمام دین مضمر ہے اور اگر یہ بات حاصل نہ ہوئی تو سب باطل پرستی اور خسارہ کی چیزیں ہیں۔ چنانچہ رسالت مآب صلعم کی سیرۃ مبارکہ کو اعتقاد اور عمل دونوں کا "سدرۃ المنتہیٰ" قرار دینا اقبال کے افکار عالیہ کا خلاصہ

ہے، وہ خود جگہ جگہ تراش کر عشق رسول کے مظاہرے کرتا ہے۔ اور اگر اس کے کلام کا نچوڑ دو لفظوں میں بیان کرنے کو کہا جائے تو اسے "عشق رسول" کہہ کر ختم کیا جا سکتا ہے۔

اقبال اور دانش ورانِ عالم

اقبال کا اصول یہ ہے کہ ؎

گفت حکمت را خدا خیر کثیر ہر کجا ایں خیر را یابی بگیر

یا جیسا کہ مولانا حالی نے کہا کہ ؎

حکمت کو اک گم شدہ لال سمجھو
جہاں پاؤ اپنا اسے مال سمجھو

چنانچہ نٹشے، شوپن ہار، ہیگل، ٹالسٹائی، کارل مارکس، اینگلز، مزدک، حکیم آئن سٹائن، ہائزن برگ، لینن، لاک، کانٹ، برگساں سب کی مدح و مذمت میزانِ عمل قرار دے کر کرتا ہے۔ اور جہاں جہاں ان کا مطالعہ حیات و کائنات اقبال کے پیامِ عشق و دلِ بیتاب سے مماثلت رکھتا ہے۔ وہاں وہاں اسے سراہا ہے اور جہاں غلط پایا ہے رد کر دیا ہے۔ گویا فلسفہ و ادب دونوں کے مطالعہ کے لئے طالبانِ حق کو عرفان کامل عطا کیا ہے۔ چنانچہ بطور مثال حکیم نطشے پر یوں کہا ہے۔

حریفِ نکتۂ توحید ہو سکا نہ حکیم نگاہ چاہئے اسرارِ لا الٰہ کے لئے

خدنگ سینۂ گردوں ہے اس کا فکرِ بلند — کمند اس کا تخیل ہے مہر و مہ کے لیے
اگرچہ پاک ہے طینت میں راہبی اس کی — ترس رہی ہے مگر لذتِ گنہ کے لیے

دوسری جگہ نیٹشے کو ان الفاظ میں یاد کیا ہے

نیشتر اندر دلِ مغرب فرو — آنکہ بر طرحِ حرم بتخانہ ساخت
قلب او مومن دماغش کافر است

اس کی تشریح خود اقبال کی زبان سے سنئے۔ جو حاشیہ کے طور پر درج ہے۔

نیٹشے نے نصرانیت پر ایسا زبردست حملہ کیا ہے کہ یہ مذہب اس حملے سے بمشکل جانبر ہو سکے گا۔ نیٹشا کی تنقید نصرانیت خالص اسلامی نکتۂ خیال سے ہے۔ اس کا دماغ اس واسطے کافر ہے کہ وہ خدا کا منکر ہے۔ مگر بعض اخلاقی نتائج میں اس کے افکار مذہب اسلام سے بہت قریب ہیں۔ قلب او مومن دماغش کافر است۔ نبی کریم نے اسی قسم کا جملہ ابن [illegible] عرب شاعر کی نسبت کہا تھا۔ آمن لسانہ وکفر قلبہ

ہیگل کے متعلق کہتا ہے۔

ہیگل کا صدف گہر سے خالی — ہے اس کا طلسم سب خیالی

افلاطون کو گو سخندانِ قدیم میں شمار کیا ہے۔ لیکن وہ استفادہ سب سے کرتا ہے اور جہاں جہاں اسے حقیقت کے موتی ملتے ہیں۔ اسے چن لیتا ہے۔ لیکن ایسا نہیں ہے کہ خوب و زشت کے امتیاز میں اس کو کوئی اصول نہ ہو۔ وہ اپنا نظریہ حیات مکمل طور پر بنا چکا ہے۔ اور وہی اس کا میزان نقد اور وہ کسی کا مقلد نہیں ہے۔ چنانچہ وہ کہتا ہے۔

زمانے با ارسطو آشنا باش — دمے با ساز بیکن ہم نوا باش

ولیکن از مقام شاں گذر کن
مشو گم اندریں منزل سفر کن

یعنی ان شعراء و حکیموں سب سے فائدہ اٹھاؤ لیکن یہ مقامات حقیقی نہیں ہیں ان میں گم نہ ہو اور آگے چلو۔ اس طرح از نگیا یا مغرب جس کی تردید کے لئے میں نے کمر باندھی ہے۔ اس کا بھی اس سے زیادہ کوئی نہ ہوگا۔

یاد ایامے کہ بودم در خمستانِ فرنگ
جام او روشن تر از جام جم و اسکندر است
چشم مست مے فروشش بادہ را پروردگار
بادہ خواراں را نگاہِ ساقیش پیغمبر است
جلوۂ او بے کلیم و شعلۂ او بے خلیل
عقل ناپروا متاعِ عشق را غارتگر است

در ہوایش گرمیٔ یک آہِ بیتابانہ نیست
رندِ ایں میخانہ را یک لغزشِ مستانہ نیست

یعنی ایک زمانہ تھا کہ جب میں خمستانِ فرنگ کا بادہ خوار تھا مجھ پر روشنی نمودار ہونے کے بعد نظر آیا کہ اگرچہ اس کے جام فرنگ، جام جم و جام اسکندر سے روشن تر ہے۔ مگر آہ بیتابانہ و لغزش مستانہ سے خالی ہے۔

اقبال ایک بڑا آرٹسٹ ہے اور وہ اپنے نظریات کو کبھی ابلیس کی زبان سے کہتا ہے کبھی ابوجہل کی زبان سے کبھی خدا یا اہرمن کے نغمے سے اسے اجاگر کرتا ہے اور کبھی دانشورانِ عالم سے لب کشائی کراتا ہے۔ چنانچہ وہ یہ واقعہ تخلیق کرتا ہے کہ لینن جو شدت سے منکر خدا تھا جب مر جاتا ہے تو وہ دیکھتا ہے کہ اس کے جذبات بے بنیاد تھے۔ اور حقیقتاً لطائف نمایاں ہے چنانچہ وہ بارگاہ رب العزت میں عذر پیش کرتا ہے اور کہتا ہے کہ میں تجھ کو کیسے جانتا! اور کیسے پہچانتا۔ کیونکہ مشرق تمام مغرب اور مغرب کے زیر اثر ہو گیا تھا۔ یہ نظم مشرق کی "غلامی از نگ" اور مغرب کے علمی نظریات کا ایسا نادر نقشہ ہے کہ ہر بات ذہن میں سماتی چلی جاتی ہے۔

اے انفس و آفاق میں پیدا ترے آیات
حق یہ ہے کہ ہے زندہ و پائندہ تری ذات
میں کیسے سمجھتا کہ تو ہے یا کہ نہیں ہے
ہر دم متغیر تھے خرد کے نظریات
آج آنکھ نے دیکھا تو وہ عالم ہوا ثابت
میں جس کو سمجھتا تھا کلیسا کے خرافات
اک بات اگر مجھ کو اجازت ہو تو پوچھوں
حل کر نہ سکے جس کو حکیموں کے مقالات
وہ کون آدم ہے کہ تو جس کا ہے معبود
وہ آدم خاکی کہ ہے زیر سماوات
مشرق کے خداوند سفیدانِ فرنگی
مغرب کے خداوند درخشندہ فلزات
یورپ میں بہت روشنی علم و ہنر ہے
حق یہ ہے کہ بے چشمۂ حیواں ہے یہ ظلمات
رعنائی تعمیر میں رونق میں صفا میں
گرجوں سے کہیں بڑھ کے ہیں بنکوں کے عمارات
ظاہر میں تجارت حقیقت میں جوا ہے
سود ایک لاکھوں کے لئے مرگ مفاجات
یہ علم یہ حکمت یہ تدبر یہ حکومت
پیتے ہیں لہو دیتے ہیں تعلیم مساوات
بیکاری و عریانی و میخواری و افلاس
کیا کم ہیں فرنگی مدنیت کے فتوحات

وہ قوم کہ فیضانِ سماوی سے ہو محروم
حد اس کے کمالات کی ہے برق و بخارات
ہے دل کے لئے موت مشینوں کی حکومت
احساسِ مروت کو کچل دیتے ہیں آلات

اقبال میں تعصب اور تنگ نظری نام کو نہیں ہے وہ خمخانۂ مشرق و مغرب کے ہر بادۂ گلفام کو چکھتا اور مزے لیتا ہے اور انتخاب پر عمل کرتا ہے۔ اسے حکمت اور دانائی کی بات جہاں ملے اسے قبول کرنے سے انکار نہیں۔ چنانچہ جس طرح وہ بائرن اور شیکسپیر وغیرہ شعرائے عظام اور فلاسفر یورپ کا ذکر کرتا ہے۔ اسی طرح مشرق کے دانش وروں کو بھی فراموش نہیں کرتا۔ جاوید نامہ جو بعض کے نزدیک اقبال کا شاہکار تسلیم کیا گیا ہے (اور بعض پیام مشرق کو شاہکار مانتے ہیں) اس میں اقبال نے آسمانوں کا سفر کیا ہے اور وہاں جن لوگوں سے ملے ہیں ان سے گفتگو کی ہے ان میں "جہاں دوست" اور "عارفِ ہندی" بھی ہیں۔ جہاں دوست کے بارے میں کچھ لوگ کہتے ہیں کہ مراد وشوا متر جی سے ہے اور کچھ کا خیال یہ ہے کہ اس سے شیوا جی مراد ہیں۔

بہر حال کوئی ہوں زمانۂ اسلام کے قبل کے بزرگ ہیں جن کی دانائیاں کتابوں میں محفوظ ہیں اور جن کو مسخ کر کے اب الوہیت کا درجہ دیا گیا ہے۔ عارفِ ہند مراد مشہور فلسفی و شاعر بھرتری ہری ہیں جن کو ہندوستان میں نمایاں حیثیت حاصل ہے۔ لیکن اگر اس کا مطلب یہ لیا جائے کہ اقبال اپنے تصورات حیات میں ان باتوں سے کہیں بھی متزلزل ہوتا ہے تو شدید غلطی ہوگی۔ وہ کوئی دریوزہ گر نہیں کہ اپنے کدو میں بھیک مانگ کر رنگ برنگ کی شراب

جمع کر دے۔ اس کا جام از تاکِ بادہ گیرم و در ساغر انگنم سے پُر ہے۔ اور اس میں قطرے کی بھی گنجائش نہیں ہے۔ البتہ وہ ہر ایک باریک نکتہ اور ہر دانائی کی بات کی داد ضرور دیتا ہے۔

اقبال کے آرٹ کا ایک کرشمہ ابوجہل کا نعرہ ہے جو در حقیقت نعت ہے۔ اس طرح کی نعت کسی اور شاعر نے کبھی نہیں لکھی۔ ظاہر میں تو ابوجہل شکایت کناں ہے اور لات و منات سے فریاد کر رہا ہے کہ وہ خانۂ کعبہ سے نہ جائیں اور اگر وہاں سے جائیں تو ہمارے دل سے نہ جائیں۔ اسی طرح وہ پیغمبرِ اسلام صلعم کا شاکی ہے لیکن شکایت میں عظیم مدح پنہاں ہے۔ شکایت ایک یہ ہے کہ ؂

با غلام خویش بر یک خواں نشست

یعنی اپنے غلام کے ساتھ ایک دسترخوان پر بیٹھ کر کھانا کھاتا ہے۔

تسخیر فطرت یا علم و عشق

آج کی متمدن دنیا کے نقش و نگار کو دیکھ کر یہ اندازہ کرنا مشکل ہے کہ ابتدائے تاریخ سے قبل کا انسان کا رہن سہن کیا ہوگا لیکن ایک دور وہ بھی تھا جب وہ غاروں اور درختوں کے سائے کے نیچے گزر بسر کرتا تھا اور گھاس پھوس اور کچا گوشت کھاتا تھا۔ اس نے ابھی آگ دریافت نہیں کی تھی کہ کھانا پکاتا۔ کپڑا بننا نہیں جانتا تھا اس لئے یا تو ننگا رہتا تھا یا درختوں کی چھال پہن لیتا تھا۔ لیکن وہ ادراک احساس حواس خمسہ سے بہرہ ور تھا۔ اور اسی کا دوسرا نام عقل ہے۔ جو اس میں ودیعت کی گئی تھی۔ چنانچہ اس نے اپنے کو اور دنیا کے سنوارنے میں تدریجی منزلیں طے کرنی شروع کیں۔ آگ دریافت کی۔ اور کچے گوشت کو بھون کر کھایا۔ غذا کے معاملے میں یہ اس کا پہلا قدم تھا اور اس کے بعد وہ روز بروز نئی دریافتیں کرتا رہا۔ انسان کے اندر آرزو اور جستجو اس طرح کوٹ کوٹ کر بھری تھیں کہ وہ اس کی طبیعت ثانیہ بنی ہوئی تھی۔ آج بھی ہم دیکھتے ہیں کہ بچہ ہر چیز کی دریافت و جستجو میں لگا رہتا ہے گویا یہ مادہ انسان کی خمیر میں ہے۔ اور اسے طبیعت ثانیہ کہنا بھی صحیح

متعین کر دیا اس کی اصل طبیعت اور اس کا اصل مذاق ہے جس عالم آب و گل میں اس کو رہنا تھا۔ اور جس ماحول میں اسے زندگی گذارنی تھی۔ وہ اس کے راستے میں رکاوٹوں سے بھرا ہوا تھا۔ بڑی بڑی جھاڑیاں گھنے جنگل مہیب غار دریا اور پہاڑ جہاں جائے اور کیا کرے! نیچر یعنی فطرت اس کی دشمن تھی۔ اس نے اسے اس سے لڑنے اور اس کو قابو میں کرنے کی تمنا پیدا کی اور یہ تمنا اس کی تخلیق میں مضمر تھی۔ اس تمنا کے لئے اسے کسی عالم کے وعظ کسی فلسفی کی تقریر کسی جوش اور ولولہ دلانے والے خطبہ کی ضرورت نہ تھی۔ وہ بہ تقاضائے فطرت اس میں تحریک ہو گیا اور اس کے یلغار کے سامنے یہ کائنات فطرت سرنگوں ہوتی رہی تھی۔ اس کی فتوحات کی کوئی انتہا نہ تھی۔ اس نے لوہے کی دریافت کی کلہاڑے بنائے جنگلوں کو کاٹا کشتیاں بنائیں اور دریاؤں کو پار کیا۔ اس کی تسخیر فطرت کے میدانِ عمل کا بڑا کامیاب دن تھا جب اس نے دانہ زمین میں ڈالا اور غلہ اگایا زراعت حقیقی معنی تمدن کی منزلِ اولین تھی اب وہ جہالت اور کم علمی کے ظلمات سے باہر نکل رہا تھا۔ اور علم و شعور کی ہلکی ہلکی شعاعیں اسے نظر آنے لگیں تھیں۔ اس نے پتھر ظروف کا استعمال سیکھا اور طرح طرح کے کھانے تیار کرنے شروع کئے۔ ان سب باتوں کو سکھانے کے لئے کوئی استاد نہ تھا نہ کوئی کتاب تھی نہ معلم تھا نہ مدرسے اور کالج تھے خود ان کے اندر موجود عقل کی رہنمائی اور خود اپنے تجربات اس کے لئے مشعلِ راہ تھے۔ رفتہ رفتہ اس نے ترقی کی ارتقائی منزلیں طے کیں اور آج خوشنما باغ دلربا پارک اور ہوٹل طرح طرح کے لذیذ کھانے انواع و اقسام کے ظروف رہنے کے لئے عمدہ سے عمدہ مکانات استراحت کے لئے نرم ملائم گدے اور مسہریاں چلنے کے لئے تیز رفتار سواریاں فرش

پر قابو پانے کے لئے دوائیں پر سکون زندگی گذارنے کے لئے قوانین دستورِ حیات کے لئے آئین موجود ہیں۔ الغرض اس نے کیا کیا نہیں کیے کہاں وہ دریا سے ڈرتا تھا اور اس پار سے اس پار جانا محال تھا اور کہاں اس نے دریا کے پانی کو ہر طرف کھیتوں میں پہنچایا بلکہ اس سے بجلی نکالی اور راستوں اور گھروں کو روشن کر دیا۔ اس نے بجلی سے مزدور کا کام لیا۔ اس نے انجن گرم کر کے کھانا پکایا کپڑے سیے گیہوں پیسا اور طرح طرح کی خدمات لیں کہاں وہ پہاڑ کو ناقابلِ عبور سمجھتا تھا اور کہاں اس نے ڈائنامائٹ سے پہاڑوں کو روئی کے گالوں کی طرح اڑا دیا۔ کبھی ہمالیہ "فصیلِ کشورِ ہندوستان" تھا۔ اب ہمالہ انسان کی حفاظت کا محتاج ہے۔ اس نے سمندروں کو مسخر کر کے دخانی جہازوں سے اس کی موجوں کو روند ڈالا۔ اس نے ہوا کو مسخر کیا اور ہزاروں میل فی گھنٹہ ہوائی جہازوں پر پرواز کرنے لگا۔ زراعت کے بعد صنعت کی نوبت آئی اور اس نے سارے عالم کو کارخانہ بنا دیا۔ اور معاش اور راحت کے نئے نئے راستے پیدا کئے۔ انسان کی لامحدود آرزوؤں اور تمناؤں کا ایک وسیع میدان ہے۔ ایک لمحہ اس کو چین نہیں۔ نت نئے فتوحات وہ کرتا رہتا ہے اور آسمانوں پر کمند ڈالتا ہے۔ آج اس کی پرواز کرۂ باد سے پرے خلاؤں میں ہے اور چاند مریخ زہرہ تک پہنچنے کا خواب دیکھ رہا ہے۔ آج وہ ہزاروں میل دور سے لوگوں سے بات بھی کرتا ہے اور ان کی شکل بھی دیکھتا ہے۔ طلسمِ ہوش ربا کے افسانے آج حقیقت بن کر سامنے ہیں۔ یہ سب علمِ انسانی کے کرشمے ہیں اور عقل کے معجزے ہیں۔ ایک زمانہ تھا جس کو پانچ چھ سو سال سے زیادہ نہیں ہوئے جب علمِ انسانی اتنا محدود تھا کہ حکیم یا ڈاکٹر کا درجہ اس کو ملتا تھا جو تمامی

علوم پر حاوی ہو۔ چنانچہ بو علی سینا حکیم نہیں کہا گیا بلکہ شیخ کہلایا اور روایت
ہے کہ صرف اس لئے کہ وہ موسیقی نہیں جانتا تھا۔ آج علم و فن نے اتنی
ترقی کی ہے کہ ایک ایک شاخ کی متعدد شاخیں ہیں اور انسان اپنی قلیل
مدت حیات میں ایک شاخ ہی میں کمال حاصل نہیں کر سکتا۔ چہ جائیکہ کل
شاخ پر نظر ڈالے اور کل موجود علم کا احاطہ تو تصور میں بھی نہیں آسکتا علم کو
آرٹ اور سائنس میں تقسیم کر کے ہر ایک کی بے شمار شاخیں اور شاخوں کی
شاخیں ہیں مثال کے لئے صرف علم الابدان کو لے لیجئے تو اس میں طب
اور جراحت کے دو بڑے شعبے ملیں گے اور ہر ایک میں الگ الگ مضامین
ہیں۔ اگر آج آپ کسی کو ڈاکٹر کہہ دیں تو سننے والا اگر ہوشیار ہے تو کچھ
نہ سمجھ سکے گا کہ آپ کیا فرما رہے ہیں۔ ابھی صرف تیس سال قبل ڈاکٹر سے
یہ مراد لی جاتی تھی کہ وہ ہر مرض بلکہ طب و جراحت کے ہر شعبے کا ماہر
ہے۔ آج آنکھ کے ڈاکٹر، کان کے ڈاکٹر، حلق کے ڈاکٹر، پھیپھڑے کے ڈاکٹر
قلب کے ڈاکٹر، ہڈی کے ڈاکٹر، الغرض ہر ہر عضو کے الگ الگ ڈاکٹر
ہیں۔ اگر بدقسمتی سے آپ بیمار ہو کر آپ کسی ماہر طبیب (ڈاکٹر) کے پاس
تھک کر چلے جائیں تو وہ آپ کے مختلف ماہرین فن کے پاس بھیج کر ان کی
رپورٹیں لے گا اور تب کوئی رائے قائم کر سکے گا۔ اگر آپ قبض جیسے معمولی
اور عالمگیر مرض میں مبتلا ہیں تو وہ دانت کے ڈاکٹر کی رپورٹ لے گا کہ
دانتوں میں پائریا یا اس قسم کی کوئی بیماری تو نہیں ہے جس سے معدہ پر
اثر پڑ رہا ہے۔ اگر بخار ہے تو خون کا معائنہ کرائے گا بھوک کا معائنہ کر لے
گا۔ الغرض علم کی وسعت اور پہنائیوں کی وجہ سے ہر ماہر فن ایک جزو
میں مقید ہو کر رہ گیا ہے۔ اور دوسرے ماہر فن کا محتاج ہے اور مشورہ

دے کر کہ آپ فلاں سے اس معاملے میں مشورہ کر کے رپورٹ لائیے اپنے عجز اور اس شاخ علم سے ناواقفیت کا اظہار کرتا ہے۔

مادہ پرستوں کا خیال ہے کہ انسان اصل نقطۂ اس کائنات کا ہے اور وہ زیور علم سے آراستہ ہے۔ اس علم کی بدولت وہ فطرت کی تسخیر کر رہا ہے۔ فطرت اس کی دشمن ہے اور یہی تنہا اس کی دشمن ہے اور جب وہ کل فطرت کو مسخر کرے گا تو وہ کامل ہو جائے گا تکمیل انسانیت کے لیے علم اور عقل کے راستہ سے نیچر کو قابو کر لینا ہی کافی ہے اور ایک ماورا الحسات قادر مطلق ہستی کا تصور محض اسکے علم کی خامی اور اس لیے اپنی ضروریات زندگی میں مجبوری و مجبوری کا دوسرا نام ہے۔ مثلاً جب تک انسان نے دریاؤں سے پانی کو نکال کر نہروں اور دیگر ذرائع سے کھیتوں کی آب پاشی کا طریقہ دریافت نہیں کیا تھا اور اس کی کھیتی کے نمود پرداخت کا انحصار صرف ابر باراں پر تھا تو پانی نہ برسنے کی شکل میں وہ عظیم الشان قادر مطلق ہستی کا تصور کر کے اس سے دعائیں مانگتا تھا کہ وہ پانی برسا دے لیکن جب اس نے نہر ٹیوب ویل اور دیگر ذرائع سے زمین اور دریا کو مسخر کر کے اور فن طبیعیات اور انجینئرنگ سیکھ کر کھیتوں کو پانی سے بھر دیا تو اب وہ پانی برسنے کی دعا نہیں کرے گا۔ اس لیے علم کی کمی اور مجبوری کا نام خدا ہے۔ ورنہ خدا کا کوئی وجود نہیں۔

دوسری طرف مذاہب کا ایک گروہ جو وحدت الوجود جیسے عقیدے کا قائل ہے، وہ مادہ اور روح دونوں کے وجود سے انکار کرتا ہے۔ اور جب مادہ کا وجود ہی نہیں ہے تو تسخیر کس کی ہوگی۔

اور جب انسان کی انا یا خودی کا وجود نہیں ہے تو تسخیر کون کرے گا۔ اور کس لئے کرے گا۔ دوسرا اگر وہ مادہ کے وجود کا تو اقرار کرتا ہے لیکن اس سے گریز یا فرار کرتا ہے اور کسی خانقاہ میں بیٹھ کر سکون پرستی اور اللہ کی یاد میں گذار دینا چاہتا ہے۔ وہ فطرت سے آویزش کا قائل نہیں۔ اگرچہ تسخیر فطرت سے جو منافع حاصل ہوں اس سے مستفیض ہونے سے احتراز نہیں رکھتا۔ وہ اپنا گھر بجلی کے چراغوں سے روشن کرتا ہے۔ لیکن بادلوں سے بجلی لانے کی مشقت سے منحرف ہے۔

اقبال کا نظریہ جو عین اسلام کی تعلیم ہے اس کو ظاہر کرنے سے پہلے ایک اور امر کی جانب اشارہ کرنا ضروری ہے۔ انسان جب جنگلوں اور غاروں میں رہتا تھا تو اسے کسی قانون یا دستور کی ضرورت نہ تھی۔ یا یہ بات ابھی اس کے شعور میں نہیں آئی تھی جس طرح وہ متمدن ہو گیا اور اس نے بڑے بڑے شہر بسائے اور مل جل کر رہنا سیکھا تو اس کو ضابطۂ حیات کی حاجت ہوئی انفرادی اور اجتماعی اور دھیرے دھیرے نوبت یہاں تک آگئی کہ فوجداری اور دیوانی اور تعزیرات آگے چل کر بین الاقوامی قوانین بھی وضع کرنے پڑے۔ اس کو حل کرنے کے راستے کیا ہیں۔ حقوق اور فرائض کی ترکیب کیسے دی جائے۔ جرائم کا انسداد اور ان کی سزائیں کیا ہوں۔ مختلف عقائد میں ہم آہنگی پیدا کرنے کا کیا طریقہ ہے۔ صلح و امن کے کیا راستے ہیں۔ انھیں قوانین کے انضباط اور تدوین اور ان پر عمل درآمد کے ضوابط کا نام تہذیب ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ یہ مسائل کس طرح حل ہوں گے۔ دنیا کے ایک بڑے گروہ کا جن میں مادہ پرستوں کے علاوہ بہت سے مذاہب کے ماننے والے بھی شامل ہیں۔

یہ خیال ہے کہ یہ مرحلے بھی عقل ہی طے کرے گی۔ انسانی عقل کل پر محیط ہے اور وہ انسان کی رہنمائی کے لئے کافی ہے۔

ایک تیسرا مرحلہ جدید مادہ پرستوں کی توجہ اس لئے منعطف نہیں ہوئی کہ وہ مادہ کے سوا خدا اور روح کے قائل ہی نہیں ہیں اور وہ مرحلہ ہے خود انسان کے ذاتی اور شخصی اعمال کا جو قوانین کی زد میں نہیں آسکتے ہیں اور نہ ان کے بارے میں کسی قسم کا قانون مرتب کیا جاسکتا ہے۔ مثلاً ماں باپ کی اطاعت اپنے چھوٹوں سے محبت مبتلائے آلام و مصائب سے ہمدردی، انسان عفو درگذر کینہ بغض حسد غیبت چغلی سے گریز وغیرہ وغیرہ اسی لئے مارکسزم ایسے کسی انفرادی اعمال صالحہ کا اسی طرح کوئی وجود نہیں ہے جیسے طرح انفرادی آزادی کوئی چیز نہیں ہے سب کچھ مجموعی انسان کے فلاح و بہبودی میں مضمر ہے اور تسخیر کائنات کی غرض بھی یہی ہے کہ انسان آرام و آسائش کی زندگی بسر کرسکے۔ انسان انسان میں فرق باقی نہ رہے۔ اور افلاس بیماری ایک انسان پر دوسرے انسان کی برتری دور ہو الغرض اصل چیز انسان نہیں بلکہ انسانوں کی سوسائٹی ہے۔

قرآن حکیم نے ان تمام خیالات و افکار کا جائزہ لیا ہے اور ایک سیدھی اور مستقیم راہ جو عام و خاص کی سمجھ میں آسکتی ہے وہ پیش کی ہے۔ اقبال نے اپنے فن کارانہ شعری مہارت سے اس کو بار بار اپنے کلام اور حسن بیان کی خوبیوں سے آراستہ کرکے پیش کیا ہے۔ علمائے اسلام نے سیدھے سادے الفاظ میں جو بات کہی تھی وہ یہ تھی کہ تمام عالم انسان کے لئے اور انسان اللہ کی عبادت کے لئے بنایا گیا ہے۔ اسی کو وہ فلسفیانہ زبان میں عصر حاضر کے تقاضوں کو پورا کرتے ہوئے اشعار کے خوبصورت

سانچے میں ڈھالتا ہے۔

جہاں تک تسخیر فطرت کا سوال ہے۔ وہ پوری حد تک مادہ پرستوں کے ساتھ جاتا ہے۔ وہ انسان کے اندر علم و عقل کی بے پناہ طاقتوں کے پنہاں ہونے کا قائل ہے۔ اسی لئے وہ حرکت کا مدح خواں اور سکون کا مخالف ہے۔ جدوجہد زندگی میں وہ انسان کو ہر وقت آگے بڑھنے کے لئے کوڑے مارتا ہے۔ اور حیات کو بے ثبات تصور کر کے مغموم و دلگیر ہو کر کنج عافیت تلاش کرنے کو انتہائی معیوب تصور کرتا ہے۔ وہ انسان کو آرزوں کا مسکن مانتا ہے اور نت نئے انداز اور نئے شان سے اس کو جلوہ گر دیکھنا چاہتا ہے ؎

محبت مجھے ان جوانوں سے ہے　　ستاروں پہ جو ڈالتے ہیں کمند

چنانچہ اس نے شاعرانہ شوخی کے ساتھ محاورہ مابین خدا و انسان میں تصنیف کیا ہے۔ اس سے مراد انسان کی قوت تسخیر فطرت کی پرزور نمائش ہے خدا انسان کو مخاطب کر کے کہتا ہے کہ میں نے یک آب و گل سے اس دنیا کو پیدا کیا۔ لیکن تو نے ایران و تاتار و زنگ میں اسے تقسیم کر دیا۔ میں نے مٹی سے لوہا بنایا تھا۔ تو نے اس سے شمشیر و تیر و تفنگ بنائے تو چمن کے درختوں کو کاٹنے کے لئے تبر بناتا ہے اور طائر نغمہ زن کے قفس تیار کرتا ہے۔

جہاں را زیک آب و گل آفریدم　　تو ایران و تاتار و زنگ آفریدی

من از خاک پولاد ناب آفریدم　　تو شمشیر و تیر و تفنگ آفریدی

تبر آفریدی نہال چمن را

قفس ساختی طائر نغمہ زن را

انسان کی یہ شرارتیں جب بیان کی گئیں تو گویا ان میں بھی اس کے

علم و تسخیر کے کرشمے شامل تھے لیکن مختصر کیے گئے تھے۔ اس لیے انسان نے جواب دیا کہ میری قوت تسخیر کی جانب بھی مائل ہے اور میں نے وہ بڑے بڑے کارنامے انجام دیے جس نے تیری صنعت عالم سازی کو جلا دی ہے۔ تو نے رات بنائی تھی۔ اندھیری تھی۔ میں نے چراغ بنا کر اُسے روشن کیا تو نے مٹی بنائی تھی۔ میں نے جام بنایا تو نے بیابان و کہسار اور نشیب و فراز زمین بنا دی تھی۔ میں نے اس کو خیابان و گلزار و باغ بنا کر آراستہ کیا۔ میں وہ ہوں کہ پتھر سے آئینہ اور زہر سے نوشینہ تیار کرتا ہوں۔

تو شب آفریدی چراغ آفریدم
سفال آفریدی ایاغ آفریدم
بیابان و کہسار و راغ آفریدی
گلستان و گلزار و باغ آفریدم
من آنم کہ سنگ آئینہ سازم
من آنم کہ از زہر نوشینہ سازم

انسان کی یہ تعلّی جو دراصل حقیقت کی آئینہ دار ہے۔ اس میں اقبال نے صرف شوخی بھر دی ہے اور گستاخی کے ساتھ انسان کے کمالات فن تسخیر کو ظاہر کیا ہے۔

اسی طرح کی شوخی اور مستی وہ "پیام مشرق" میں اپنی نظم بہشت میں ظاہر کرتا ہے۔ اقبال کے نزدیک یہ دنیا حرکت و جہد و جہد اور آرزوؤں کی تکمیل کی ہے۔ آدم جب بہشت میں تھے تو ان کی زندگی میں کوئی طوفان نہ تھا۔ وہ آرزو کی خلش سے آزاد تھے چنانچہ میلادِ آدم انکار ابلیس اغوائے آدم کے مختلف عنوانات سے جب مکمل ڈراما اقبال نے زیرِ عنوان تسخیر فطرت لکھا ہے۔ اس کے آخر میں آدم کی زبان سے اسی

حقیقت کا انکشاف کرایا ہے۔ وہ اسی دنیا کو بہشت سے بھی زیادہ دلکش پاتے ہیں۔ کیونکہ یہاں سوز و گداز ہے۔ آسمانوں کا راستہ ڈھونڈھنا اور ستاروں کو راز دار بنانا ہے۔ یہ وہ زندگی ہے جس میں تغیر ہے اور آرزو کی تلاش ہے۔

آدم از بہشت بیرون آمدہ می گوید

چہ خوش است زندگی را ہمہ سوز و ساز کردن
دل کوہ و دشت و صحرا بدمے گداز کردن
ز قفس درے کشادن بہ فضائے گلستانے
رہ آسمان نوردن بہ ستارہ راز کردن
بہ گداز ہائے پنہاں بہ نیاز ہائے پیدا
نظرے ادا شناسے بہ حریم ناز کردن
گہے جز یکے ندیدن بہ ہجوم لالہ زارے
گہے خار نیش زن را ز گل امتیاز کردن
ہمہ سوز ناتمامم ہمہ درد آرزویم
بگمان دہم یقیں را کہ شہید جستجویم

بہشت کے سکون کو یوں بیان کرتا ہے کہ اس کے یوسف نے زنداں کا درد نہیں دیکھا۔ اور اس کی زلیخا کے پاس دل نالاں نہیں ہے۔ اس کا خلیل حریف آتش نہیں ہے اور اس کے کلیم کے جان میں ایک بھی شرر نہیں ہے۔ شبہات اس کے یقین پر چھاپہ نہیں مارتے ہیں۔ اور وصال کو اندیشہ ہجراں نہیں ہے اور رب کہتا ہے کہ بہشت کو

ذوقوں کی دنیا ہے۔ اس میں رہ کر کیا کرو گے۔ اس میں یزداں ہے اور شیطان نہیں ہے۔

مزی اندر جہانے کور ذوقے
کہ یزداں دارد و شیطاں ندارد

یہ کلام کی شوخی اور شاعرانہ گستاخی ہے جو اقبال کے یہاں قدم قدم پر ملے گی۔ مگر فطرت میں حرارت آرزو ہے۔ آج بادلوں پر قابو پایا تو کل چاند پر تیر ڈالا۔ ایک کو فتح کیا تو دوسرے کی تلاش ہے۔ یہاں کشمکش ہے جدوجہد ہے۔ بہشت میں سکون اور راحت ہے۔ اس لئے وہ کشمکش حیات کو اس عنوان سے پیش کرتا ہے کہ گویا جنت بھی اس کے مقابلے میں ہیچ ہے۔ یہ شاعرانہ مبالغہ ہے۔ غرض یہ ہے کہ جہاد زندگانی کی جانب پوری قوت سے توجہ مبذول ہو۔

تسخیر ذات میں سب سے پہلی چیز یہ ہے کہ ہر قدم پر خطرہ ہے۔ اسی لئے وہ خطرے کو دعوت دیتا ہے وہ پکارتا ہے:

اگر خواہی حیات اندر خطر زی

یعنی اگر زندگی چاہتا ہے تو خطرے کے اندر رہنا سیکھ۔

خطر تاب و تواں را امتحاں است
عیار ممکنات جسم و جاں است

خطر تمہارے تاب و تواں کا امتحان اور جسم و جان میں کیا امکانات پوشیدہ ہیں۔ ان کا میزان ہے۔ اس شوخی کے ساتھ دیکھئے کہاں تک کہہ دیتا ہے کہ زندہ دلوں کے لئے زندگی صرف خطر طلبی ہے۔ اس سے اگر کعبے کے راستے میں خطرہ نہ ہو تو وہاں کا بھی سفر میں نہ کروں گا۔

بجنبش زندہ دلاں زندگی جفا طلبی است
سفر بکعبہ نکردم کہ راہ بے خطر است

اور کہتا ہے کہ:

چوں موج سازِ وجودم ز سیل بے پرواست
گمان مبر کہ دریں بحر ساحلے دارم

یعنی جس طرح موج دریا اور سمندر کے سیلاب میں چلتی ہے وہی حال میرا ہے۔ یہ مت سمجھنا کہ میں سمندر میں ساحل یا کنارہ تلاش کرتا ہوں۔

تسخیر فطرت کا سبق اقبال معراج پیغمبر علیہ السلام سے بھی لیتا ہے چنانچہ صاف لفظوں میں کہا ہے کہ:

سبق ملا ہے یہ معراجِ مصطفیٰ سے مجھے
کہ عالمِ بشریت کی زد میں ہے گردوں

پھر تسخیر فطرت برائے عقل کو کس لطیف لیکن واضح انداز سے بیان کیا ہے:

فطرت کو خرد کے روبرو کر — تسخیر مقام رنگ و بو کر
تو اپنی خودی کو کھو چکا ہے — کھوئی ہوئی شے کی جستجو کر
تاروں کی فضا ہے بیکرانہ — تو بھی یہ مقام آرزو کر
عریاں ہیں ترے چمن کی حوریں — چاکِ گل و لالہ کو رفو کر

بے ذوق نہیں اگرچہ فطرت
جو اس سے نہ ہو سکا وہ تو کر

جب آدم دنیا میں آتے ہیں تو روح ارضی ان کا اس طرح

استقبال کرتی ہے۔

کھول آنکھ زمیں دیکھ فلک دیکھ فضا دیکھ
مشرق سے ابھرتے ہوئے سورج کو ذرا دیکھ
اس جلوۂ بے پردہ کو پردوں میں چھپا دیکھ
ایام جدائی کے ستم دیکھ جفا دیکھ
بے تاب نہ ہو معرکۂ بیم و رجا دیکھ

اس تیرے تصرف میں یہ بادل یہ گھٹائیں
یہ گنبد افلاک یہ خاموش فضائیں
یہ کوہ یہ صحرا یہ سمندر یہ ہوائیں
تھیں پیش نظر کل تو فتوحوں کی ادائیں
آئینہ ایام میں آج اپنی ادا دیکھ

سمجھے گا زمانہ تری آنکھوں کے اشارے
رہ جائیں گے تجھ دور سے گردوں کے ستارے
ناپید ترے بحر تخیل کے کنارے
پہنچیں گے فلک تک تری آہوں کے شرارے
تعمیر خودی کر اثر آہ رسا دیکھ

خورشید جہاں تاب کی جو تیرے شرر میں
آباد ہے اک تازہ جہاں تیرے ہنر میں
جچتے نہیں بخشے ہوئے فردوس نظر میں
جنت تری پنہاں ہے ترے خون جگر میں
اے پیکر گل کوشش پیہم کی جزا دیکھ

آئینہ ترے عود کا تار ازل سے
تو جنس محبت کا خریدار ازل سے
تو پیرو صہبائے اسرار ازل سے
محنت کش و خوں ریز و کم آزار ازل سے
ہے راکب تقدیر جہاں تیری رضا دیکھ

الغرض وہ اس تمام عالم رنگ و بو زمین سے آسمان اور ستاروں تک کو مسخر کر کے انسان کے تصرف میں لانا چاہتا ہے۔ اور یہی اسلام کی تعلیم ہے۔

والارض کا اور کیا منشا ہے زمینوں اور آسمانوں سب کو مسخر کر لینا ہی ایک مومن کی شان ہے۔ چنانچہ ضرب الاحزاب مصنفہ ملا علی

تاریخ میں جو دعائیں درج ہیں۔ ان میں ایک جگہ یہ بھی درج ہے کہ کل عالم کو میرے لیے مسخر کردے۔ یہ دعائیں قرآن اور حدیث سے ماخوذ ہیں۔ گویا یہ ایک مومن کا نصب العین حیات ہے کہ وہ سارے عالم کو مسخر کرے اور زمینوں اور آسمانوں پر تصرف کرے۔ دنیائے اسلام کے نامور مفکر و خطیب مولانا سید ابوالحسن علی ندوی ناظم ندوۃ العلماء لکھنؤ "صاحبِ باولیا" کے عنوان سے مولانا محمد یعقوب کے اقوال الفرقان میں تحریر فرماتے رہے ہیں۔

اس میں ایک جگہ حضرت نے اس دعا کا حوالہ دیتے ہوئے کہا کہ اگر سارا عالم ہمارے تصرف میں آجائے تو ہم اس کو کھلائیں گے کہاں سے یہ ایک صوفیانہ نکتہ تھا ایک مخصوص حلقہ کو تعلیم تھی۔ غالباً مقصود یہ تھا کہ دعا مانگو ایسی جو دل سے نکلے اور جس کے لئے عمل پیدا ہو۔ لیکن حقیقت ظاہر ہے کہ یہ دعا مومن کو سکھائی گئی ہے۔

عالم اسلامی اور سائنس سے بے خبری

علم ایک وسیع معنی میں استعمال ہوتا ہے۔ اور اس میں دیگر علوم کے ساتھ علم سائنس بھی شامل ہے۔ نبی پاک صلعم نے فرمایا کہ اطلب العلم ولو کان بالصین (یعنی علم طلب کرو خواہ وہ چین میں ملے)۔ اسی طرح آپ نے یہ بھی فرمایا کہ علم کو گہوارے سے موت تک طلب کرو علم کے حصول پر اس قدر زور شانِ نبوت کو ظاہر کرتی ہے جس کے لے مستقبل کی تمام تاریکیوں میں روشنی ہموار تھی لیکن علماء اسلام

نے حدیث بالا میں ایک لفظ کا اضافہ کر دیا اور فرمایا کہ علم سے مراد علم دین ہے ۔ حالانکہ قانون کی شرح کا ایک مسلمہ اصول ہے کہ اس میں کسی لفظ کا اضافہ جائز نہیں ہے ۔ اس لئے مناسب یہ تھا کہ علم سے مراد مطلق علم لیا جاتا ۔ اس تشریح نے بڑے دوررس نتائج پیدا کئے اور میرا جو ناچیز مطالعہ ہے اس کی بنا پر میں کہہ سکتا ہوں کہ دنیا میں اسلام کے زوال کی وجوں میں ایک بڑی وجہ یہ ہے اور یہ بات اقبال کی نظر سے پنہاں نہ تھی ۔ اس لئے وہ علم کی کہیں مذمت نہیں کرتا بلکہ ہر جگہ وہ مقام دیتا ہے جس کی وہ مستحق ہے البتہ اسے شوخی اور گستاخی سے روکتا ہے اور اپنے حد کے اندر رہنا سکھاتا ہے ۔ زوال کی دوسری بڑی وجہ سلطانی ہے ۔ اور تیسری ملاؤں کی تنگ نظری اور خرقہ پوش ارباب خانقاہ کی بے بصری ہے

باقی نہ رہی تیری وہ آئینہ ضمیری
اے کشتۂ ملائی و سلطانی و پیری

ترکی کی تاریخ بتلاتی ہے کہ وہ یورپ ایشیا اور افریقہ پر اس لئے حکمران رہے کہ ان کے پاس آلات حرب جدید دوسروں کی نسبت زیادہ بہتر تھے ۔ لیکن جب یورپ میں علم اور سائنس کی روشنی آئی تو اس سے ترکوں نے اجتناب کیا اور اسی قدیم روش پر قائم رہ گئے ۔ ترکوں نے سب سے پہلے رائفل کا استعمال کیا اور جب سلطان سلیم نے مصر پر حملہ کیا اور اسے چشم زدن میں تاخت و تاراج کر کے حکمران طبقہ مملوکوں کے امیر کو گرفتار کیا تو اس نے سلطان سلیم کے سامنے ایک بیباک تقریر کی جس کا خلاصہ درج ذیل ہے ۔ "آج جو ہم کو شکست ہوئی ہے اور تم کو فتح تو اس کی وجہ یہ نہیں ہے کہ تم ہم سے زیادہ بہادر ہو ہم

یقیناً تم سے زیادہ بہادر ہیں۔ لیکن تمہارے پاس رائفل اور توپیں ہیں اور ہمارے پاس یہ سامان نہیں ہیں۔ یہ رائفل اور توپیں ہمارے پاس بھی لائی گئیں تھیں اور ہمارے سردار نے ہم کو مشورہ دیا تھا کہ ہم انھیں اپنا لیں۔ لیکن ہم لوگوں نے انکار کیا اور کہا کہ ان سے لڑنا مردانگی کے خلاف ہے تب ہمارے امیر نے کہا تھا کہ ایک دن اس سے تم نیست و نابود کئے جاؤ گے پھر اس نے ایک آہ سرد کھینچی اور کہا کہ افسوس آج وہی دن ہے۔"

علم کے خزانے یونان سے اٹلی اور اٹلی سے بغداد اور وہاں سے یورپ پہنچے۔ یورپ ان کی روشنی سے جگمگا اٹھا لیکن سلطانی کی وجہ سے حکومت ترکیہ میں جو اضمحلال آگیا تھا۔ اس نے اس کو جدت پسندی اختیار کرنے سے باز رکھا نوبت یہاں تک پہنچی کہ اگر جدید طرز پر فوج کو ترتیب دینے کا کوئی سلطان خیال بھی کرتا تھا۔ تو فوج بغاوت کر دیتی تھی اور علماء ان کی تائید کرتے تھے اور اسے بدعت قرار دیتے تھے۔ ایک زمانہ تھا کہ ترکی کا سمندروں پر قبضہ تھا اور آخر کار وہ دن بھی آیا کہ جب طرابلس الغرب پر اطالیہ نے حملہ کیا تو ترکی بیچارگی سے دیکھتا رہ گیا۔ وہاں وہ فوج کس طرح بھیج سکتا تھا۔ جب اس کے پاس جنگی جہاز ہی نہ تھے۔ مختصر انجام یہ ہوا کہ وہ دن بھی تھا جب سلیمان عظیم نے وائنا کا محاصرہ اس دعوے کے ساتھ کیا تھا کہ میں آج وائنا کے محل میں ناشتہ کروں گا اور میرے گھوڑے وائنا کے اصطبل میں دانہ کھائیں گے اور یہ وہ دن بھی آیا کہ بیرونی طاقتوں نے قسطنطنیہ پر قبضہ کر لیا۔ قوم پرور ترکوں میں سے جو ملا اسے تہ تیغ کر دیا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ

میں جاکر روپوش ہوگئے۔ وہ تو ایک رندِ بے باک جرأت تخلندانہ کے ساتھ اٹھا اور کچھ بجا لے گیا۔ ورنہ ترکوں کو غلامی کی زندگی بسر کرنی پڑتی قبائے خلافت پرزے پرزے ہو گئی اور عالمِ اسلامی منتشر ہو کر مرکز سے محروم ہو گیا۔ یہ سب کچھ ہوا اس لیے کہ علم سے پہلو تہی کی گئی اور نماز روزہ حج اور زکوٰۃ کے مسائل سیکھنے کے سوا اور ہر چیز کو علم کے وسیع و بسیط حد سے خارج کر دیا گیا۔

حکومت کا تو کیا رونا کہ وہ ایک عارضی شے تھی
نہیں دنیا کے آئینِ مسلم سے کوئی چارہ
مگر وہ علم کے موتی کتابیں اپنے آبا کی
جو دیکھو ان کو یورپ میں تو دل ہوتا ہے سیپارہ

اور آج بھی وہی عالم ہے تمام دنیائے اسلام کے مدارس میں مذہبیات کے علاوہ جن سے مراد قرآن حدیث اور فقہ کی تعلیم ہے صرف آرٹ کے بعض اجزاء کی تعلیم دی جاتی ہے۔ مثلاً قدیم فلسفہ اور قدیم منطق وغیرہ۔ سائنس کی تعلیم شجرِ ممنوعہ کی حیثیت رکھتی ہے اور علوم جدیدہ سے اجتناب یہ و احتراز عین اسلام تصور کیا جاتا ہے اس ہمارے ملک میں درسِ نظامیہ سے باہر نکلنا کسی طرح ممکن نہیں ہو سکتی ہے۔ ندوۃ العلماء نے ضرور علمِ بغاوت بلند کیا تھا۔ لیکن وقت نے اسے بھی مرعوب کر دیا۔ سرسید علیہ الرحمۃ نے علی گڈھ میں کالج کی بنیاد ڈالی اور سائنس اور علوم جدیدہ کی تعلیم پر کمربستہ ہوئے تو ان پر دھڑا دھڑ کفر کے فتوے صادر ہوئے خود سرسید فرماتے ہیں ؎

فدا دارم دلِ بریاں ز عشقِ مصطفیٰ دارم نہ دارم ہیچ کافر ساز و سامانے کہ من دارم

اسرائیلی فوجوں کے مقابلے میں عربوں کی شرمناک شکست اور بیت المقدس کے نکل جانے کا حادثہ بالکل تازہ ہے۔ اس کے روحانی اسباب و علل جو بھی ہوں اور میں ان کا منکر نہیں جو بات اظہر من الشمس ہے وہ یہ ہے کہ عرب چھوٹی چھوٹی ریاستوں میں بٹا ہوا ہے۔ سلطانی کا زور ہے اور سائنس کا فقدان۔ پورے عرب میں ایک سوئی بھی نہیں بنتی ہے اور نہ اس جانب دھیان ہے۔ حالانکہ اگر کل عرب متحد ہو جائے تو وہ اٹمی پاور بن سکتا ہے۔ وہ اپنے وجود کو قائم رکھنے کے لئے یا تو امریکہ یا روس کی امداد کا محتاج ہے وہ خود آلات حرب تیار نہیں کر سکتا غیر سے دریوزہ گری اور امداد غیر پر انحصار کے سلسلے میں مدح و شکایت کا ایک دفتر بے پایاں ہماری کل تگ و دو کا شاہکار ہے۔ اسرائیل عرب ملک کے اندر ایک ناسور بن گیا ہے۔ اور صیہونی تحریک بڑے بڑے منصوبوں کے خواب دیکھ رہی ہے اور عرب میں اپنے پیروں پر کھڑے ہونے کی کسی کوشش کا ابھی آغاز تک نہیں ہوا۔

الغرض جس زمانے میں اقبال نے اپنا پیام سنانا شروع کیا اس وقت سائنس اور علوم جدیدہ کی تعلیم اگر کفر و شرک نہیں تو بدعت سیۂ ضرور قرار پا چکی تھی۔ اس لئے اقبال کو اس معاملے میں اصل اسلام کو دلوں میں پیوست کرنے میں محنت کرنی پڑی۔ علم کی ستائش اور اس کی پہنائیوں اور قوتوں کا اظہار اقبال نے طرح طرح سے کیا اور تسخیر کائنات کا بھولا ہوا سبق یاد دلایا۔ اس معاملے میں وہ مادہ پرستوں سے ایک انچ بھی پیچھے نہیں ہے وہ پوری کائنات کو انسان کے تصرف میں لانا چاہتا ہے۔ اور آسمان اور زمین سب کو مسخر کر لینا چاہتا ہے۔

اس کا عقیدہ ہے کہ پوری کائنات پر انسان کو حکمرانی کرنے کی طاقت وقدرت ہے

علم کے حدود اور تسخیر نفس

لیکن یہاں تک آنے کے بعد وہ مادہ پرستوں سے مکر جانے پر تل جاتا ہے اور ان کی کم بصری کو واضح کرتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ انسان کا دشمن محض فطرت نہیں ہے بلکہ اس کا ایک اور سخت دشمن اس کا نفس ہے اور اس نے انسان کے کامل ہونے کیلئے صرف یہ شرط کافی نہیں ہے کہ وہ کائنات کو مسخر کرے۔ بلکہ اسے اپنے نفس پر بھی قابو حاصل کرنا ہوگا۔ اور اس کی تسخیر کا بھی عمل سیکھنا ہوگا۔ بلا اس کے وہ کامل نہیں ہو سکتا۔

ہم دیکھتے ہیں کہ انسان کے باہر جتنی بڑی دنیا آباد ہے۔ اس سے کم وسیع وہ عالم نہیں ہے۔ جو خود اس کے اندر ہے۔ واقعات دو طرح کے ہوتے ہیں ایک وہ انسان سے باہر کی دنیا میں پیش آتے ہیں۔ دوسرے وہ جو خود اس کے اندر وقوع پذیر ہوتے ہیں۔ جو واقعات اس کے اندر وارد ہوتے ہیں وہ بڑا گہرا اثر رکھتے ہیں۔ انسان میں غصہ اور رحم، رنج و خوشی، احسان و ظلم، شرافت و خست، عفو و انتقام، کرم و بخشش، حسد و بغض و کینہ وغیرہ وغیرہ کے مشتعلہ جذبات پیدا ہوتے رہتے ہیں اور علم سے حاصل کی ہوئی طاقت کا استعمال وہ انہی جذبات کے تحت کرتا ہے۔ اس لئے اگر وہ علم کے ذریعے عالم کو مسخر کرنے کا فن سیکھ لے لیکن یہ کیا ضروری ہے کہ وہ ان کا استعمال بھی صحیح کرے۔ مثلاً آج امریکہ اور روس دونوں اسی میدان میں پہنچے ہیں اور

ہر وقت مشینوں سے چلنے والے جہاز تیار کھڑے ہیں۔ اگر دونوں میں سے کسی ایک کی خباثتِ نفس نتائج سے بے پروا ہو جائے تو صرف ایک بٹن دبانا ہے فوراً طیارے اڑ جائیں گے اور پورا عالم تین دن سے سات دن کے اندر فنا ہو جائے گا۔ اس کا علاج بیچارے علم کے پاس کچھ بھی نہیں یہ معاملہ اس کی دسترس سے باہر ہے۔ اس نے تو ایک طاقت مہیا کر دی اور پھر یہ کہہ کر کنارہ کش ہو گیا۔۶

خواہ آسماں و خواہ زمین مشو

اس لئے ضروری ہے کہ نفس کی بھی تسخیر کی جائے اور اسے بھی قابو میں لایا جائے اور بے راہ روی سے بچایا جائے بلا اس کے یہ دنیا رہنے کے قابل نہیں ہو سکتی۔ اور انسان کی تکمیل نامکمل رہ جائے گی۔ نفس کی تسخیر کے لئے آئین مرتب کرنے ہوں گے۔ وہ آئین کیا ہوں اور کیسے مرتب ہوں۔ یہ سوالات ہیں جو تمام عالم میں زمانۂ دراز سے ہیجان پیدا کئے ہوئے ہیں۔ سب سے پہلے تو یہ بات منطقی حیثیت سے طے ہو جاتی ہے کہ انسان کو ضبطِ نفس اور اس کے لئے آئین کی ضرورت ہے

ہر کہ تسخیرِ مہ و پروین کند   خویش را زنجیریِ آئین کند

یعنی جو مہ و پروین کی تسخیر کرتا ہے۔ وہ اپنے آپ کو آئین کا پابند کرتا ہے۔ اقبال ان ماہرین علم النفس کا ہم خیال ہے جو یہ سمجھتے ہیں کہ آزاد وہی شخص ہے جو ـــــ مقید ہے۔ ایک آدمی لاابالی پن کا شکار ہے۔ جب جی چاہتا ہے سو کر اٹھتا ہے۔ کبھی ۰ بجے اور کبھی ۳ بجے کھانا کھاتا ہے۔ سونے کا بھی کوئی وقت نہیں۔ الغرض اس کی زندگی میں کوئی ضابطہ نہیں اور ایک دوسرا شخص ہے جس کا ہر کام وقت سے ہوتا ہے۔

وہ گھڑی کی سوئی کا پابند ہے۔ بظاہر وہ شخص آزاد ہے جو کسی اصول
کا پابند نہیں ہے۔ لیکن درحقیقت آزاد وہ ہے جس نے اپنے آپ کو
پابند کر رکھا ہے۔ چنانچہ اس کی وہ مثالیں دیتا ہے ؎

باد را زندانِ گل خوشبو کند — قید بو را نافۂ آہو کند

یعنی جب بو ہرن کی ناف میں بند ہو جاتی ہے تو مشک بنتی ہے۔

می زند اختر سوئے منزل قدم — پیش آئینے سر تسلیم خم

چاند ایک آئین کے تحت اپنا قدم اٹھاتا ہے تو وہ منزل تک پہنچ
جاتا ہے

قطرہ ہا دریاست از آئین وصل — ذرہ ہا صحراست از آئین وصل
باطن ہر شے ز آئینے قوی — تو چرا غافل ازیں ساماں روی

قطرے وصل کے آئین پر عمل کر کے دریا اور ذرے اسی آئین وصل
پر عمل پیرا ہو کر صحرا بنتے ہیں۔ فطرت ایک آئین کے تحت کام کر رہی ہے
اور ہر چیز کا باطن آئین ہی سے قوی ہوتا ہے تو تو اس ساز و سامان سے
کیسے غافل گزر سکتا ہے۔

اس لیے سب سے پہلی ضرورت ضبط نفس ہے۔

نفس تو مثل شتر خود پرور است — خود پرست و خود سوار و خود سر است
مرد شو آور زمام او بکف — تا شوی گوہر اگر باشی خزف
ہر کہ بر خود نیست فرمانش رواں — می شود فرماں پذیر از دیگراں

یعنی تیرا نفس اونٹ کی طرح خود پرور خود پرست اور خود سر
ہے اگر تو مرد ہے تو اس کی باگ اپنے ہاتھ میں لے تاکہ اگر تو ٹھیکری
ہے تو گوہر بن جا۔ جو شخص کہ اپنے اوپر حکمرانی نہیں کرتا وہ دوسروں

کا فرمان پذیر یا غلام بن جاتا ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ ضبط نفس یا تسخیر نفس کا نسخہ کیا ہے کس طرح اسے حاصل کیا جائے۔ اقبال کا نظریہ یہ ہے کہ تسخیر نفس میں سب سے بڑی رکاوٹ "خوف" ہے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ انسان ہر وقت موہوم آنے والی بلاؤں سے ڈرتا رہتا ہے اگر موٹر پر سوار ہوتا ہے تو سوچتا ہے کہ کہیں ٹکرا نہ جائے۔ کتنے آدمی ریل گاڑی پر انجن کے قریب نہیں بیٹھتے کہ شاید کہیں گاڑی پٹڑی سے اتر گئی یا لڑ گئی تو سب سے پہلے ہم کو ہی جان کا خطرہ ہوگا۔ ایک ذرا سا گلے میں خراش ہوا اور دو چار دن رہ گیا تو کینسر کا ڈر آ لگا۔ گھر میں سوتا ہے تو چونک چونک اٹھتا ہے کہ کہیں چور نہ آ گئے ہوں۔ انسان کی زندگی میں ہر چہار جانب خوف ہی خوف اولاد اور اعزہ کی محبت اور عافیت اور زندگی کی جانب سے ہر لحظہ خطرہ لگا رہتا ہے۔ یہ سب خوف کس لئے ہیں۔ اقبال کے نظریے میں اس خوف کی وجہ ان چیزوں سے محبت ہے جن کے ضائع ہونے کا اس کو اندیشہ رہتا ہے۔ خوف اور محبت دونوں ساتھ ساتھ چلتے ہیں اور یہ دونوں تسخیر نفس اور انسان کے کامل ہونے میں حائل ہیں۔

طرح تعمیر تو از گل ریختند — با محبت خوف را آمیختند

یعنی تیری تعمیر ایسی مٹی سے ہوئی ہے جس میں محبت کے ساتھ خوف کو ملا دیا گیا ہے

خوف دنیا خوف عقبیٰ خوف جاں — خوف آلام زمین و آسماں
حب مال و دولت و حب وطن — حب خویش و اقربا و حب زن

یعنی دنیا کا خوف عقبیٰ کا خوف آلام زمین و آسمان کا خوف یعنی

وہ ہم خوف کو کہیں ایسا ایسا نہ ہو جائے جیسا کہ اوپر ذکر کیا گیا۔ اس تمام خوف کی بنیاد کیا ہے۔ مال کی دولت کی وطن کی محبت خویش و اقربا اور کبھی بیوی کی محبت۔ ان سب کی محبت میں گرفتار ہو کر انسان ہر لمحہ خوف میں مبتلا رہتا ہے۔ صوفیاں باصفا اور خداجویاں معنی آشنا کا قول ہے کہ مذہب انسان کو ان تمام خوف کی حالتوں سے نجات دینے کے لئے آیا ہے۔

ان تمام خوف کی حالتوں سے نجات کا کیا ذریعہ ہے۔ اس کا جواب دینے کے لئے حیات و کائنات کے بسیط مطالعہ اور اس کی حقیقت معلوم کرنے کی ضرورت ہے۔ اقبال کا جواب یہ ہے کہ پہلی سچائی اس کائنات کی ایک قادر مطلق ذات یگانہ بے ہمتا و بے مثال ظرف زماں و مکاں کے قیود سے ماورا ازلی و ابدی ناممکن الادراک واجب الوجود کی ہستی ہے جسے اسلام توحید کہتا ہے اور اقبال نے بھی توحید کا نام دیا ہے۔ وہ حقیقۃ الحقائق ہے۔ وہی انسان کا خالق ہے اور اس نے قوانین مرتب کئے ہیں جن پر عمل کرکے انسان نفس کی تسخیر کر سکتا ہے۔

اب صرف یہ بات باقی رہ جاتی ہے کہ وہ قوانین الہیہ انسان کو ملیں کیسے۔ اللہ تعالی لامحدود اور انسان محدود کے لئے اپنے محدود بنانا اس کی شان اعلی و ارفع کے خلاف اور محدود کا لامحدود تک پہنچنا ناممکن ع

واں لڑی آنکھ جہاں اپنا گذارہ ہی نہیں

اس لئے ضرورت ہوئی کہ کوئی درمیانی رشتہ قائم کیا جائے تاکہ وہاں کا پیغام ہم تک پہنچ سکے اور اس کے لئے رسالت لابدی قرار پائی اور انبیاء رسول یا پیغمبر خدا کا پیغام انسانوں تک لائے اور انہیں

الٰہیہ سے باخبر کیا انسانی فہم و ادراک اور علم کی وہاں تک رسائی نہیں ہو سکتی صرف وحی یا الہام ربانی کے ذریعہ کام ہو سکتا ہے۔ اور اس کا نام اقبال کی زبان میں "عشق" ہے اور "علم" جو تسخیر کائنات سکھاتا ہے اسے تابع "عشق" ہونا چاہئے۔ تب انسان کی تکمیل کی منزل طے ہو گی۔

عقلے کہ جہاں سوزد یک جلوۂ بیباکش
از عشق بیاموزد آئین جہاں تابی

یعنی عقل جہاں سوز ہے لیکن وہ عشق صرف ایک جلوۂ بے باک ہے اور عقل عشق سے آئین جہاں تابی سیکھتی ہے۔ انسان نوامیس الٰہیہ کی اطاعت پر مجبور ہے اور جب وہ ضبط نفس اور اطاعت سے پوری طرح بہرہ ور ہو گا تو نیابت الٰہی کے مرتبہ پر قائم ہو گا اور یہی اس کی تکمیل کا خلاصہ ہے اور بلا اس کے وہ ناقص رہے گا۔ رسالت کے لئے وہ پیغمبر عربی محمد الرسول اللہ صلعم کو خاتم النبیین اور آپ کے پیام کو آخری وحی اور آپ کی امت خاتم اقوام اور خیر الامم مانتا ہے۔ جو کچھ اوپر بیان کیا گیا۔ اب اقبال کی زبان سے سنئے۔

تا عصائے لا الٰہ داری بدست — ہر طلسم خوف را خواہی شکست
ہر کہ حق باشد چو جاں اندر تنش — خم نگردد پیش باطل گردنش
خوف را در سینۂ او راہ نیست — خاطرش مرعوب غیر اللہ نیست
ہر کہ در اقلیم لا آباد شد — فارغ از بند زن و اولاد شد
می کند از ما سوا قطع نظر — می نہد ساطور بر حلق پسر

یعنی جس کسی شخص نے توحید کی عصا ہاتھ میں لے لی وہ خوف کے ہر طلسم کو توڑ ڈالے گا جس کے جسم و جاں میں توحید سرایت کر گئی۔ اس کی گردن کسی باطل کے آگے نہیں جھکتی ہے۔ اس کے سینہ میں خوف کو راستہ مل ہی نہیں سکتا اور اس کا دل کسی غیر اللہ کو پسند ہی نہ کرے گا اور

نہ اس جانب مائل ہوگا جو توحید کے احاطہ میں آگیا وہ زن و فرزند کی قید سے آزاد ہو جاتا ہے اور ہر ما سوا اللہ سے قطع نظر کر لیتا ہے۔ حتیٰ کہ بیٹے کے گلے پر بھی چھری چلا دیتا ہے (اشارہ ہے حضرت ابراہیم علیہ السلام کی طرف جنھوں نے حلق اسمٰعیل پر چھری رکھ دی تھی)

ایک شبہ یہ پیدا ہو سکتا ہے کہ اقبال نے خوف حزن سے چھٹکارہ حاصل کرنے کو کہا ہے۔ لیکن وہ قرآن کی آیۃ اَلَآ اِنَّ اَوْلِیَآءَ اللّٰهِ لَا خَوْفٌ عَلَیْهِمْ وَلَا هُمْ یَحْزَنُوْنَ (خبردار اولیاء اللہ کو نہ کسی قسم کا خوف ہے نہ حزن) کی تشریح کر رہا ہے اور ہر بندۂ مومن کو اس مقام تک لے جانا چاہتا ہے ؎

عطا اسلاف کا جذبِ دروں کر | شریکِ زمرۂ لا یحزنون کر

اقبال ان لوگوں میں نہیں ہے جو اولیاء اللہ سے عقیدت کو اصنام پرستی سے ملا دیتے ہیں۔ اس کے خم خانہ کی شراب عام ہے۔ جہاں تک رسالت کا تعلق ہے۔ اقبال اس کا ایک عظیم شیدائی ہے۔

طینتِ پاک مسلماں گوہر است | آب و تابش از یمِ پیغمبر است

یعنی مسلمان کی طینت پاک مثل ایک موتی کے ہے جس کے آب و تاب پیغمبر علیہ السلام کے سمندر سے ہوئی ہے ؎

آبِ نیسانی بہ آغوشش درآ | در میانِ قلزمش گوہر برآ

آب نیساں کا ایک قطرہ بن کر آپ کے آغوش میں جا اور آپ کے قلزم سے موتی بن کر نکل۔ لیکن توحید اور رسالت کا بیان تفصیل سے آگے آئے گا۔ یہاں صرف موضوع متن کے لحاظ سے اشارہ کرنا مقصود ہے۔

اعمال صالحہ

عقیدہ توحید و رسالت کو لازم قرار دینے کے بعد اقبال کہتا ہے کہ اگرچہ عقیدہ ضروری ہے لیکن بلا عمل صالح کے وہ تکمیل انسانیت نہ کر سکے گا

لذت ایمان فزاید از عمل   مردہ آن ایماں کہ ناید در عمل

عمل سے ایمان کی لذت میں اضافہ ہوتا ہے اور وہ ایمان جو عمل میں نہ آسکے مردہ ہو جاتا ہے اور عمل کے لئے اس نے اسلام کے ارکانِ خمسہ کی تعلیم دی ہے چنانچہ کہتا ہے

لا الہ باشد صدف گوہر نماز   قلب مسلم را حجِ اصغر نماز
در کفِ مسلم مثال خنجر است   قاتل فحشا و بغی و منکر است
روزہ بر جوع و عطش شبخون زند   خیبر تن پروری را بشکند
مومناں را فطرت افروز است حج   ہجرت آموز و وطن سوز است حج
طاعتے سرمایہ جمعیتے   ربط اوراقِ کتاب ملتے
حب دولت را فنا سازد زکوٰۃ   ہم مساوات آشنا سازد زکوٰۃ
دل ز حتیٰ تنفقوا محکم کند   زر فزاید الفت زر کم کند
این ہمہ اسباب استحکام تست   پختہ محکم اگر اسلام تست

اہل قوت شو ز وردِ یا قوی
تا سوارِ اشترِ خاکی شوی

یعنی کلمہ توحید سیپ اور نماز اس کے اندر موتی ہے اور مومن کے قلب کے لئے نماز حجِ اصغر کا درجہ رکھتی ہے۔ نماز مسلمان کے ہاتھ میں ایک خنجر ہے جس سے فواحش نافرمانی اور منکرات تہ تیغ ہو جاتے

ہیں۔ (یہ قرآن پاک کی اس آیت کا ترجمہ ہے۔ اِنَّ الصَّلٰوۃَ تَنْھٰی عَنِ الْفَحْشَآءِ وَالْمُنْکَرِ) روزہ بھوک اور پیاس پر شبخون مارتا ہے اور تن پروری کے قلعہ کو توڑ ڈالتا ہے۔ حج مومن کے لئے نورانیت افروز ہے۔ وہ ہجرت کے قوانین سکھاتا ہے اور وطن کے غلط نظریے کو جس سے انسان صرف وطنی بن کر رہ جاتا ہے، پھونک ڈالتا ہے۔ (کیونکہ حج سے انسان دنیا کا شہری بنتا ہے) زکوٰۃ حب دولت کو فنا کرتی ہے اور مساوات کا سبق دیتی ہے۔ قرآن پاک میں آیا ہے کہ

(لَنْ تَنَالُوا الْبِرَّ حَتّٰی تُنْفِقُوْا مِمَّا تُحِبُّوْنَ)

چنانچہ اقبال کہتا ہے کہ اس آیت کے معنی سے دل کو محکم کرنا زکوٰۃ کا کام ہے۔ اس سے دولت میں اضافہ ہوتا ہے اور پیسے کی محبت گھٹتی ہے۔ اگر تیرا اسلام محکم ہے تو ان سب باتوں پر عمل کرنے سے تجھے استحکام حاصل ہوگا۔ اس خاک پر حکمرانی کرنے کے لئے تم جب ہی اہل ہو سکتے ہو جب "یا قوی" کا ورد کر کے اہل قوت بنو یعنی تسخیر کائنات کے ساتھ تسخیر نفس بھی کرو۔ اور علم کے تابع عشق رکھو۔

عقیدہ اور عمل سے انسان کی تکمیل کا راستہ بتلانے کے بعد وہ اصرار کرتا ہے کہ وہ نوامیس الٰہیہ کی کامل اطاعت و اتباع ہونا چاہئے۔ اقبال نے جا بجا "غلام پختہ کار" بننے کا مشورہ دیا ہے اور کہیں کہیں جمہوریت کی مخالفت کی۔ اس سے بعض لوگوں نے یہ نتیجہ نکال لیا کہ اقبال فاشزم کا یا ڈکٹیٹر شپ کا قائل ہے اسے کبھی بھولنا نہ چاہئے کہ اقبال دستور حیات مرتب کر رہا ہے، اس کا مطمح نظر IDEALISM یعنی مقصدی) عملی سیاست (PRACTICAL POLITICS سے اسے کوئی غرض نہیں

اور نہ وہ رخصت و اجازت کی گفتگوؤں اور بحثوں سے واسطہ رکھتا ہے وہ اسلام پیش کر رہا ہے۔ اور ان عقاید و اعمال کی تشریح کر رہا ہے جو فرد اور ملت کے لئے ہونے چاہیں اور اصولاً ہونے چاہئیں۔ وہ کوئی نئی دنیا اور اس میں رہنے کے لئے نئے آدم کی تعمیر کے لئے نہیں اٹھا ہے۔ وہ حیات و کائنات کے بارے میں اپنا مطالعہ پیش کر رہا ہے اور انسان کے تکمیل کے لئے ضروریات بتلا رہا ہے۔ اس کی نگاہ وسیع ہے اور وہ ہر گوشہ پر نظر ڈالتا ہے۔ وہ ایک ایسے فرد کا تخیل پیش کرتا ہے جس کے انا میں بہت سی صفات ہوں جن کو وہ تشریح کے ساتھ بیان کرتا ہے پھر وہ ایک "ملت" کا نقشہ پیش کرتا ہے جو وطن کی قید سے آزاد اور عالمی ہو اور اس کے لئے نوامیس الٰہیہ کی پابندی لازمی قرار دیتا ہے۔ کہیں کہیں رخصت و اجازت کے طور پر کوئی درمیانی راستہ اختیار کرنا پڑے تو وہ اس کے موضوع سخن سے خارج ہے۔ کسی قوم کا دوسری قوم کا غلام ہونا یہ بالکل جداگانہ بات ہے۔ اور اس سے نفرت کا اظہار جس طرح اقبال نے کیا ہے کہیں اور ملنا مشکل ہے۔ یہاں صرف ایک قطعہ پیش کیا جاتا ہے

آدم از بے بصری بندگی آدم کرد
گوہرے داشت ولے نذر قباد و جم کرد
یعنی از خوئے غلامی زسگاں خوار تر است
من ندیدم کہ سگے پیش سگے سر خم کرد

یعنی ایک انسان کے لئے دوسرے انسان کی غلامی بے بصری ہے اور جو ایسا کرتا ہے وہ کتے سے بھی بدتر ہے۔ کیونکہ ایک کتا

دوسرے کتے کے آگے سرخم نہیں کرتا۔ اب اس نے جمہوریت کے عنوان سے جو لکھا ہے اس کا جائزہ لیجیے۔

متاعِ معنیٔ بیگانہ از دوں فطرتاں جوئی
ز موراں شوخیٔ طبعِ سلیمانے نمی آید
گریز از طرزِ جمہوری غلامِ پختہ کارے شو
کہ از مغزِ دو صد خر فکرِ انسانے نمی آید

کیا دوں فطرتوں سے متاعِ معنی بیگانہ تلاش کرتے ہو کسی سلیمان کی شوخیٔ طبع موروں میں نہیں آ سکتی۔ طرزِ جمہوری سے بھاگو اور غلام پختہ کار بنو کیونکہ اگر دو سو گدھوں کے مغز اکٹھا کر دیے جائیں تو انسان کی فکر اس سے پیدا نہیں ہو سکتی۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ جمہوریت عوام الناس آئین و دستور و قوانین ترتیب دیتے ہیں۔ نوامیس الہیہ کی پابندی نہیں ہوتی اور نوامیس الہیہ پر عمل کیے بغیر انسان کبھی اپنی منزلِ کمال کو نہیں پہنچ سکتا۔ اس نے اس طریقہ جمہوری کو ترک کرو اور نوامیس الہیہ کے غلام پختہ کار بنو۔ جمہوریت کا اصول یہی ہے کہ انسانوں کے ایک گروہ کو جو کسی جغرافیائی حدود میں آباد ہوں اور ایک حکومت کے ماتحت رہنا چاہیں اپنے لیے آئین و ضوابط مرتب کرنے کا اختیار ہے اور اس کا اصول الاصول یہ ہے کہ عوام کو غلط قانون بنانے کا بھی حق ہے اور صحیح قانون بنانے کا بھی حق ہے۔ یعنی خود انسں کے درمیان ان آئین اور ضابطوں کی صحت کے ذمہ وار نہیں ہیں۔ جمہوریت کے بہت سے فوائد ہیں اور ملکی نظام پر بنا جمہوریت دنیا کے موجودہ نظاموں میں سب سے بہتر ہے اس کا اقبال منکر نہیں لیکن انسا

کے جو قوانین وہ مرتب کرتا ہے، اس سے یہ موضوع بحث خارج ہے۔ اقبال کی نگاہ میں عقل انسانی کے حدود ہیں اور وہ تسخیر نفس یا ضبط نفس یا تہذیب نفس کا مرحلہ حل کرنے سے قاصر ہے۔ اس کے لیے کائنات نے جو سبق توحید و رسالت کا دیا ہے اور اس کی راہ سے جو قوانین اسے ملے ہیں وہی کافی ہو سکتے ہیں اور اس کا نام وہ عشق رکھتا ہے اور اپنے مرشد رومی کے حسب ذیل شعر سے اکتساب کرتا ہے۔

بہ خرد راہ عشق می پوئی　　بہ چراغ آفتاب می جوئی

اسی طرح وہ مولانا روم کا یہ شعر بھی پیش کرتا ہے۔

داند آں کو نیک بخت و محرم است
زیرکی ز ابلیس و عشق از آدم است

چنانچہ ایک فلسفہ سید زادہ کو لکھا ہے۔

آدم کو ثبات کی طلب ہے　　دستور حیات کی طلب ہے

اور اس کے لیے کیا ہونا چاہیے یہ لکھ کر کہ میں برہمن زادہ ہوں میرے آب و گل میں فلسفہ ہے اور میں اس کی رگ رگ سے باخبر ہوں۔ عقل انسانی کے سالم کی حدود کو یوں ظاہر کیا ہے۔

شعلہ ہے ترے جنوں کا بے سوز　　سن مجھ سے یہ نکتۂ دل افروز
انجام خرد ہے بے حضوری　　ہے فلسفۂ زندگی سے دوری
افکار کے نغمہ ہائے بے صوت　　ہیں ذوق عمل کے واسطے موت
دیں مسلک زندگی کی تقویم　　دیں سر محمد و براہیم
دل در سخن محمدی بند　　اے پور علی ز بو علی چند

چوں دیدۂ راہ بیں نداری
قائد قرشی بہ از بخاری

اس طرح کہتا ہے ۔

خرد کے راہرو روشن بصر ہے　　خرد کیا ہے چراغ رہگذر ہے
درونِ خانہ ہنگامے ہیں کیا کیا　　چراغ رہگذر کو کیا خبر ہے

لیکن جیسا کہ کہا گیا۔ وہ علم کے مدارج اور مقامات کا بھی بڑا معروف ہے۔ البتہ اس کو تابع عشق رکھنا چاہتا ہے ۔

گذر جا عقل سے آگے کہ یہ نور　　چراغ راہ ہے منزل نہیں ہے

ایک نظم علم عشق میں اسے جاگر کیا ہے ۔

علم نے مجھ سے کہا عشق ہے دیوانہ پن
عشق نے مجھ سے کہا علم ہے تخمین و ظن
بندۂ تخمین و ظن کرم کتابی نہ بن
عشق سراپا حضور علم سراپا حجاب

شرح محبت میں ہے عشرت منزل حرام
شورش طوفاں حلال لذت ساحل حرام
عشق پہ بجلی حلال عشق پہ حاصل حرام
علم ہے ابن الکتاب عشق ہے ام الکتاب

اسی طرح کہتا ہے کہ علم تو زبان و مکاں کی پیمائش ہے یعنی اسمی آب و گل یعنی مادہ سے اس کا تعلق ہے اور ذکر (یعنی عشق) انسان واجب الوجود تک لے جاتا ہے ۔

مقام ذکر کمالاتِ رومی و عطار　　مقام فکر مقالاتِ بو علی سینا
مقام فکر ہے پیمائش زماں و مکاں　　مقام ذکر ہے سبحان ربی الاعلیٰ

اسی طرح دوسرا قطعہ بہ عنوان وحی ملاحظہ ہو ۔

عقل بے مایہ امامت کی سزاوار نہیں — راہبر ہو ظن و تخمین تو زبوں کار حیات
فکر بے نور ترا جذب عمل بے بنیاد — سخت مشکل ہے کہ روشن ہو شب تار حیات
خوب و ناخوب عمل کی ہو گرہ وا کیوں کر — گر حیات آپ نہ ہو شارح اسرار حیات

اقبال کا مطلب ہے عقلِ انسانی سے اگر تہذیبِ نفس کے مراحل طے کئے جائیں تو عقل تو قیاس آرائیوں سے کام لے گی جس طرح عقل نے مادہ کی تسخیر میں سبب اور نتیجہ سے کام لیا تھا اور اس کا نام سائنس ہے۔ وہ چیز یہاں ممکن نہیں ہے۔ اس لئے اس بات کا پتہ کیسے چلے گا کہ کیا چیز خوب اور کیا ناخوب ہے۔ جب کہ خود حیات شارح حیات نہ ہو گی یعنی خالق انسان جو اپنی فطرت سے واقف ہے خود اس کے لئے قانون مرتب کر کے نہ دے وہ چیز البتہ یقینی ہے اور اس لئے وحی کی ضرورت ہے۔

اقبال تقدیر کا قائل نہیں اس کا خیال ہے کہ احکام الٰہی کی کامل اتباع سے تقدیریں پلٹ جاتی ہیں۔

پابندی تقدیر کہ پابندی احکام — یہ مسئلہ مشکل نہیں اے مردِ خردمند
ایک آن میں سو بار بدل جاتی ہے تقدیر — ہے اس کا مقلد ابھی ناخوش ابھی خورسند
تقدیر کے پابند نباتات و جمادات — مومن فقط احکام الٰہی کا ہے پابند
عبث ہے شکوۂ تقدیر یزداں — تو خود تقدیر یزداں کیوں نہیں ہے
قدرت کے مقاصد کا عیار اس کے ارادے — دنیا میں بھی میزان قیامت میں بھی میزان

ع نگاہِ مردِ مومن سے بدل جاتی ہیں تقدیریں

اقبال کہتا ہے کہ عصرِ حاضر کے انسان نے عقل کی اتباع اور عشق سے گریز کر کے بڑی ٹھوکر کھائی ہے۔ وہ رازِ حیات سے ناآشنا ہو گیا اور اس کی دنیا تاریک ہو گئی۔

عشق ناپید و خرد گزدش صورت مار — عقل کو تابع فرمان نظر کر نہ سکا
ڈھونڈنے والا ستاروں کی گزرگاہوں کا — اپنے افکار کی دنیا میں سفر کر نہ سکا
اپنی حکمت کے خم و پیچ میں الجھا ایسا — آج تک فیصلۂ نفع و ضرر کر نہ سکا
جس نے سورج کی شعاعوں کو گرفتار کیا — زندگی کی شب تاریک سحر کر نہ سکا

تہذیب مغربی میں یہی خامی ہے کہ اس کی روح مذہبیت اور آئین الٰہی کی پابند نہ ہونے سے پاک نہیں رہ گئی ہے۔ اور روح کی پاکیزگی کے بغیر نہ ضمیر پاک رہ سکتا ہے اور نہ خیالات بلند، اور ذوق لطیف پیدا ہو سکتا ہے۔

فساد قلب و نظر ہے فرنگ کی تہذیب
کہ روح اس مدنیت کی رہ سکی نہ عفیف
رہے نہ روح میں پاکیزگی تو ہے ناپید
ضمیر پاک و خیال بلند و ذوق لطیف

اسی لئے وہ سیاست جو دین سے الگ اور صرف عقل انسانی کی تابع ہوتی ہے۔ وہ شیطان کی کنیز اور پست فطرت اور ضمیر مردہ بن جاتی ہے یعنی سیاست اور مذہبیت کو لازمی ایک سا پابند ہونا چاہیے۔

میری نگاہ میں ہے یہ سیاست لادیں
کنیز اہرمن و دوں نہاد و مردہ ضمیر
ہوئی ہے ترک کلیسا سے حاکمی آزاد
فرنگیوں کی سیاست ہے دیو بے زنجیر
متاع غیر پہ ہوتی ہے جب نظر اس کی
تو ہیں ہراول لشکر کلیسا کے سفیر

دوسری جگہ کہا ہے کہ عیسائیت چونکہ رہبانیت کی تعلیم دیتی ہے۔ اس نے اس کو حاکمی سے کوئی تعلق نہیں اس لئے دین جانِ حق اور حاکمی تنِ بے جان بن گئی ہے۔

کلیسا سبحۂ پطرس شمارد — کہ او با حاکمی کارے ندارد
بکارے حاکمی مکر و فنے بیں — تن بے جاں و جاں بے تنے بیں

اقبال یقین کے ساتھ مغربی تہذیب کی موت اور اسلام کے جلوہ گر ہونے کی پیشین گوئی کرتا ہے ؎

ستارے سے آگے مقام ہے جس کا — وہ مشتِ خاک ابھی آوارگانِ راہ میں ہے
خبر ملی ہے خدایانِ بحر و بر سے مجھے — فرنگ رہگذرِ سیلِ بے پناہ میں ہے
خدائے لم یزل کا دستِ قدرت تو زباں تو ہے — یقیں پیدا کر اے غافل کہ مغلوبِ گماں تو ہے
پرے ہے چرخِ نیلی فام سے منزل مسلماں کی — ستارے جس کی گردِ راہ ہوں وہ کارواں تو ہے
مکاں فانی مکیں آنی ازل تیرا ابد تیرا — خدا کا آخری پیغام ہے تو جاوداں تو ہے
جہانِ آب و گل سے عالمِ جاوید کی خاطر — نبوت ساتھ جس کو لے گئی وہ ارمغاں تو ہے

سبق پھر پڑھ صداقت کا عدالت کا شجاعت کا
لیا جائے گا تجھ سے کام دنیا کی امامت کا

توحید

نہ با ملا نہ با صوفی نشینم | تو می دانی کہ من آنم نہ اینم
نویس اللہ جو بر لوح دلِ من | کہ ہم خود را و ہم او را فاش بینم

توحید اسلام کا بنیادی نکتہ ہے اور اسی پر کل عمارت تعمیر ہوئی ہے۔ تمام انبیا کرام ابتداء آفرینش سے اسی کی تعلیم کے لئے آتے رہے۔ اور محمد عربی صلعم آخری نبی تھے جن کے بعد قیامت تک کوئی نبی نہ ہوگا توحید سے مراد ایک قادرِ مطلق ماورا المحسوسات ہستی کا ان صفات کے ساتھ تصور ہے جو قرآن نے بیان کی ہیں اللہ کی ذات و صفات گیا ہیں۔ بہتر ہے کہ ان کو امام الہند مولانا ابو الکلام آزاد کی زبان سے بیان کیا جائے مولانا ابو الکلام آزاد ترجمان القرآن جلد اول کے صفحہ ۱۷۰ پر تحریر فرماتے ہیں :-

• قرآن کے تصور الٰہی کی ایک بنیادی خصوصیت یہ ہے کہ اس نے کسی طرح کی اعتقادی مداہنت اس بارے میں جاری نہیں رکھی وہ اپنے توحیدی اور تنزیہی تصور میں سرتا سر بے میل و بے لچک رہا اس کی

یہ مضبوط فکر کسی طرح بھی ہمیں روادارانہ طرزِ عمل سے روکنا نہیں چاہتی البتہ اعتقادی مناقشوں کے تمام دروازے بند کر دیتی ہے۔

قرآن نے تصورِ الٰہی کی بنیاد انسان کے عالمگیر وجدانی احساس پر رکھی ہے۔ یہ نہیں کیا ہے کہ اسے فکر و نظر کی کاوشوں کا ایک ایسا معمہ بنا دیا ہو جسے کسی خاص طبقہ کا ذہن ہی حل کر سکے انسان کا عالمگیر وجدانی احساس کیا ہے؟ یہ ہے کہ کارخانۂ ہستی خود بخود پیدا نہیں ہو گیا ہے اور اس لئے ضروری ہے کہ ایک صانعِ ہستی موجود ہو۔ پس قرآن بھی اس بارے میں عام طور پر جو کچھ بتلاتا ہے وہ اتنا ہی ہے اس سے زیادہ جو کچھ ہے وہ مذہبی عقیدہ کا معاملہ نہیں انفرادی و ذاتی تجربہ و احوال کا معاملہ ہے۔ اس لئے وہ اس کا بوجھ جماعت کے افکار پر نہیں ڈالتا۔ اسے اصحابِ جہد و طلب کے لئے چھوڑ دیتا ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:-

"اور جو لوگ ہم تک پہنچنے کی کوشش کریں گے تو

ہم بھی ضرور ان پر راہ کھول دیں گے اور اللہ نیک کرداروں

سے الگ کب ہے وہ تو ان کے ساتھ ہے"

"اور ان لوگوں کے لئے جو یقین رکھتے ہیں زمین میں

کتنی ہی حقیقت کی نشانیاں ہیں اور خود تمہارے اندر بھی

پھر کیا تم دیکھتے نہیں ؟"

اسی مقام سے فرق مراتب بھی نمایاں ہو جاتا ہے جو اسلام نے بالکل ایک دوسری شکل و نوعیت میں عوام و خواص کا ملحوظ رکھا ہے۔ ہندو مفکرین نے عوام و خواص میں الگ الگ تصور اور عقیدے تقسیم کئے۔ اسلام نے تصور اور عقیدے کے اعتبار سے کوئی امتیاز جائز نہیں رکھا۔ وہ حقیقت کا ایک ہی عقیدہ ہر انسانی دل و دماغ کے آگے پیش کرتا ہے۔"

پھر صفحہ ۱۶۶ پر لکھتے ہیں۔

جہاں تک توحید و اشراک کا تعلق ہے۔ قرآن کا تصور اس درجہ کامل اور بے لچک ہے کہ اس کی کوئی نظیر پچھلے تصورات میں نہیں ملتی

اگر خدا اپنی ذات میں یگانہ ہے تو ضروری ہے کہ وہ اپنی صفات میں بھی یگانہ ہو۔ کیونکہ ان کی یگانگت کی عظمت قائم نہیں رہ سکتی اگر کوئی دوسری ہستی اس کے صفات میں شریک و سہیم مان لی جائے تو قرآن سے پہلے توحید کے ایجابی پہلو پر تو تمام مذاہب نے زور دیا تھا لیکن سلبی پہلو نمایاں نہیں ہو سکا تھا۔ ایجابی پہلو یہ ہے کہ خدا ایک ہے۔ سلبی یہ ہے کہ اس کی طرح کوئی نہیں۔ اور جب اس کی طرح کوئی نہیں تو ضروری ہے کہ جو صفتیں اس کے لئے ٹھہرائی گئی ہیں۔ ان میں کوئی دوسری ہستی شریک نہ ہو۔ پہلی بات توحید فی الذات سے اور دوسری توحید الصفات سے تعبیر کی گئی ہے۔ قرآن سے پہلے اقوام عالم کی استعداد اس درجہ بلند نہیں ہوئی تھی کہ توحید فی الصفات

کی نزاکتوں اور بندشوں کی متحمل ہو سکتی اس لئے مذاہب نے تمام تر زور توحید فی الذات پر دیا۔ توحید فی الصفات اپنی ابتدائی اور سادہ حالت میں چھوڑ دی گئی۔

چنانچہ یہی حال ہے کہ ہم دیکھتے ہیں کہ باوجودیکہ تمام مذاہب قبل قرآن میں عقیدہ توحید کی تعلیم موجود تھی لیکن کسی نہ کسی صورت میں شخصیت پرستی عظمت پرستی اور اصنام پرستی نمودار ہو تی رہی اور رہنمایانِ مذاہب اس کا دروازہ بند نہ کر سکے ہندوستان میں غالباً اوّل روز ہی سے یہ بات تسلیم کر لی گئی تھی کہ عوام کی تشفی کے لئے دیوتاؤں اور انسانی عظمت کی پرستاری ناگزیر ہے اس لئے توحید کا مقام صرف خواص تک ہونا چاہئے۔ فلاسفۂ یونان کا بھی یہی خیال تھا۔ یقیناً وہ اس بات سے بے خبر نہ تھے کہ کوہ المپس کے دیوتاؤں کی کوئی اصلیت نہیں تاہم سقراط کے علاوہ کسی نے بھی اس کی ضرورت محسوس نہیں کی کہ عوام کے اعتقاد میں خلل انداز ہوں۔ وہ سمجھتے تھے کہ اگر دیوتاؤں کی پرستش کا نظام قائم نہ رہا تو عوام کی مذہبی زندگی درہم برہم ہو جائے گی فیثا غورس کی نسبت بیان کیا گیا ہے کہ جب اس نے اپنا مشہور حسابی قاعدہ معلوم کر لیا تھا تو اس کے شکرانہ میں سو بچھڑوں کی قربانی دیوتاؤں کی نذر کی تھی۔

اس بارے میں سب سے نازک معاملہ معلم و رہنما کی شخصیت کا تھا یہ ظاہر ہے کہ کوئی تعلیم عظمت و رفعت حاصل نہیں کر سکتی جب تک معلم کی شخصیت میں بھی عظمت کی شان پیدا نہ ہوئے لیکن شخصیت کی عظمت کے حدود کیا ہیں؟ یہیں آکر سب کے قدموں نے ٹھوکر کھائی

وہ اس کی ٹھیک ٹھیک حد بندی نہ کر سکے نتیجہ یہ نکلا کہ شخصیت کو خدا کا اوتار بنا دیا کبھی ابن اللہ سمجھ لیا کبھی شریک و سہیم ٹھہرا دیا اور اگر یہ نہیں کیا تو کم از کم اس کی تعظیم میں بندگی و نیاز کی سی شان پیدا کر دی یہودیوں نے ابتدائی عہد کی گمراہیوں کے بعد کبھی ایسا نہیں کیا کہ پتھر کے بت تراش کر ان کی پوجا کی ہو لیکن اس بات سے وہ بچ نہ سکے کہ اپنے نبیوں کی قبروں پر ہیکل تعمیر کر کے انہیں عبادت گاہوں کی سی شان و تقدیس دے دیتے تھے گو تم بدھ کی نسبت معلوم ہے کہ اس کی تعلیم میں اصنام پرستی کے لیے کوئی جگہ نہیں تھی لیکن نہ صرف بدھ کی ناک اور بادگاروں پر معبد تعمیر کیے گئے بلکہ مذہب کی اشاعت کا ذریعہ بھی یہ سمجھا گیا کہ ان کے مجسموں سے زمین کا کوئی گوشہ خالی نہ رہے مسیحیت کی حقیقی تعلیم سراسر توحید کی تعلیم تھی لیکن ابھی اس کے ظہور کو پورے سو برس بھی نہیں گذرے تھے کہ الوہیت مسیح کا عقیدہ نشوونما پا چکا تھا۔

لیکن قرآن نے توحید فی الصفات کا ایسا کامل نقشہ کھینچ دیا کہ اس طرح کی تمام لغزشوں کے دروازے بند ہو گئے۔ اس نے صرف توحید ہی پر زور نہیں دیا بلکہ شرک کی راہیں بھی بند کر دیں اور یہی اس باب میں اس کی خصوصیت ہے۔

وہ یہ کہتا ہے کہ ہر طرح کی عبادت اور نیاز کی حق صرف خدا کی ذات ہے۔ پس اگر تم نے عابدانہ عجز و نیاز کے ساتھ کسی دوسری ہستی کے سامنے سر جھکا دیا تو توحید الٰہی کا اعتقاد باقی نہ رہا۔ وہ کہتا ہے یہ اسی کی ذات ہے جو انسانوں کی پکار سنتی اور ان کی دعائیں

قبول کرتی ہے۔ پس اگر تم نے اپنی دعاؤں اور طلب گاریوں میں کسی دوسری ہستی کو بھی شریک کر لیا تو گویا تم نے اُسے خدائی خدائی میں شریک کر لیا وہ کہتا ہے دعا استعانت رکوع سجود عجز و نیاز اعتماد و توکل اور اسی طرح کے تمام عبادت گذارانہ اور نیاز مندانہ اعمال وہ اعمال ہیں جو خدا اور اس کے بندوں کا رشتہ قائم کرتے ہیں۔ پس اگر تم نے ان اعمال میں کسی دوسری ہستی کو بھی شریک کر لیا تو خدا کے رشتہ عبودیت کی یگانگی باقی نہ رہی۔ اس طرح عظمتوں کبریائیوں کارسازیوں بے نیازیوں کا جو اعتقاد تمہارے خدائی ہستی کا تصور پیدا کرتا ہے۔ وہ صرف خدا ہی کے لئے مخصوص ہونا چاہئے۔ اگر تم نے ویسا ہی اعتقاد کسی دوسری ہستی کے لئے بھی پیدا کر لیا تو تم نے خدا کا شریک ٹھہرا لیا اور توحید کا عقیدہ درہم برہم ہو گیا۔ یہی وجہ ہے کہ سورۃ فاتحہ میں اِیَّاکَ نَعْبُدُ وَ اِیَّاکَ نَسْتَعِیْنُ کی تلقین کی گئی ہے۔ اس میں اول تو عبادت کے ساتھ استعانت کا بھی ذکر کیا گیا ہے۔ پھر دونوں جگہ مفعول کو مقدم کیا جو مفید یعنی صرف تیری ہی عبادت کرتے ہیں اور صرف تجھی سے مدد طلب کرتے ہیں۔ اس کے علاوہ تمام قرآن میں اس کثرت کے ساتھ توحید فی الصفات اور رد اشتراک پر زور دیا ہے کہ شاید ہی کوئی سورت ایسا کوئی صفحہ اس سے خالی ہو۔

مقام نبوت

سب سے زیادہ اہم مسئلہ نبوت کی حد بندی کا تھا یعنی اگر معلم کی شخصیت کو اس کی اصلی جگہ میں محدود کر دینا تاکہ شخصیت پرستی کا ہمیشہ کے لئے سدباب ہو جائے اس بارے قرآن نے جس طرح صاف

اور قطعی لفظوں میں پیغمبر اسلام کی بشریت اور بندگی پر زور دیا ہے وہ محتاج بیان نہیں۔ ہم یہاں صرف ایک بات کی طرف توجہ دلائیں گے۔ اسلام نے اپنی تعلیم کا بنیادی کلمہ جو قرار دیا ہے وہ سب کو معلوم ہے۔

اَشْهَدُ اَنْ لَّا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَاَشْهَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ

(یعنی میں اقرار کرتا ہوں کہ خدا کے سوا کوئی معبود نہیں اور میں اقرار کرتا ہوں کہ محمد (صلعم) خدا کے بندے اور اس کے رسول ہیں) اس اقرار میں جس طرح خدا کی توحید کا اعتراف کیا گیا ہے۔ ٹھیک اسی طرح پیغمبر اسلام کی بندگی اور درجہ رسالت کا بھی اعتراف ہے۔ غور کرنا چاہیے کہ ایسا کیوں کیا گیا؟ صرف اس لئے کہ پیغمبر اسلام کی بندگی اور درجہ رسالت کا اعتقاد اسلام کی اصل واساس بن جائے اور اس کا کوئی موقع ہی باقی نہ رہے کہ عبدیت کی جگہ معبودیت کا اور رسالت کی جگہ اوتار کا تخیل پیدا ہو۔ ظاہر ہے کہ اس سے زیادہ اس معاملہ کا تحفظ کیا کیا جا سکتا تھا؟ کوئی شخص دائرہ اسلام میں داخل ہی نہیں ہو سکتا جب تک وہ خدا کی توحید کے ساتھ پیغمبر اسلام کی بندگی کا بھی اقرار نہ کرے۔

یہی وجہ ہے کہ ہم دیکھتے ہیں کہ اسلام کی وفات کے بعد مسلمانوں میں بہت سے اختلافات پیدا ہوئے۔ لیکن ان کی شخصیت کے بارے میں کوئی سوال پیدا نہیں ہوا۔ ابھی آپ کی وفات پر چند گھنٹے بھی نہ گذرے تھے کہ حضرت ابوبکر صدیق نے سر منبر اعلان کر دیا تھا

"جو کوئی تم میں محمد (رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم) کی پرستش کرتا تھا سو اسے معلوم ہونا چاہیے کہ محمد (صلعم) نے وفات پائی اور

جو کوئی تم میں اللہ کی پرستش کرتا تھا تو اسے معلوم ہونا چاہئے کہ

اللہ کی ذات ہمیشہ زندہ ہے اس کے لئے موت نہیں ۔

قرآن سے پہلے علوم و فنون کی طرح مذہبی عقائد میں بھی خاص و عام کا امتیاز ملحوظ رکھا جاتا تھا اور خیال کیا جاتا تھا کہ خدا کا ایک تصور تو حقیقی ہے ایک تصور مجازی ہے چنانچہ ہندوستان میں خداشناسی کے تین درجے قرار دیے گئے عوام کے لئے دیوتاؤں کی پرستش خواص کے لئے براہ راست خدا کی پرستش خاص الخواص کے لئے وحدۃ الوجود کا مشاہدہ یہی حال فلاسفہ یونان کا تھا ۔ وہ خیال کرتے تھے کہ ایک غیر مرئی اور غیر مجسم خدا کا تصور صرف اہل علم و حکمت ہی کر سکتے ہیں عوام کے لئے اسی میں امن ہے کہ دیوتاؤں کی پرستاری میں مشغول رہیں ۔

لیکن قرآن نے حقیقت و مجاز یا خاص و عام کا کوئی امتیاز باقی نہ رکھا اس نے سب کو خدا پرستی کی ایک ہی راہ دکھائی اور سب کے لئے صفات الہی کا ایک ہی تصور پیش کیا وہ حکما اور عرفا سے لے کر جاہل عوام سب کو حقیقت کا ایک ہی جلوہ دکھاتا ہے اور سب پر اعتقاد و ایمان کا ایک ہی دروازہ کھولتا ہے ۔ اس کا تصور جس طرح ایک حکیم و عارف کے لئے سرمایۂ تفکر ہے ؛ اسی طرح ایک چرواہے اور دہقان کے لئے سرمایۂ تسکین ہے ۔

اقبال کا نظریہ

اس بات کو بار بار دہرانے کی ضرورت نہیں ہے کہ اقبال کا نظریہ وہی ہے جو اسلام کا ہے اور جس کی وضاحت مولانا ابو الکلام آزاد نے کی ہے لیکن اقبال کا طرزِ بیان و اندازِ گفتگو عصرِ حاضر کے لب و لہجہ میں ہے۔ بقول غالب

ہر چند ہو مشاہدۂ حق کی گفتگو
بنتی نہیں ہے بادہ و ساغر کہے بغیر

اسلامی توحید کے بارے میں حسب ذیل باتیں خیال میں رکھنے کی ہیں۔

(۱) ایک واجب الوجود ماورا المحسوسات قادر مطلق اسماء حسنی سے مزین خالق کائنات بے مثال و بے ہمتا ہستی کا تصور۔

(۲) اس کا کوئی شریک و سہیم نہیں وہ اپنی ذات اور صفات میں یگانہ ہے۔

(۳) وہی عبادت و نیاز کا مستحق ہے اور ہر قسم کی امداد اسی سے طلب کرنی چاہئے۔

(۴) اس کا رحم و کرم اس کا عفو و احسان بے پایاں ہے اور اس لئے وہی محبت و عشق کا مستحق ہے۔ اقبال انھی نظریات کو محاسن کلام سے آراستہ کرکے پیش کرتا ہے۔

نشانِ راہ ز عقلِ ہزار حیلہ مپرس
بیا کہ عشق کمالے ز یک فنی دارد

یعنی عقل و قیاس و ظن و تخمین سے خدا کے وجود کا پتہ نہیں چل سکتا عشق کے راستہ ہی سے اس کا نشان ملے گا۔ اس کو شیخ سعدی علیہ الرحمۃ نے یوں کہا ہے۔ ؎

اے برتر از خیال و قیاس و گمان و وہم

مشام تیز سے ملتا ہے صحرا میں نشاں اس کا

ظن و تخمیں سے ہاتھ آتا نہیں آہوئے تاتاری

بجھا بھی ہوئی ہے رنگ و بو میں | خرد کھوئی ہوئی ہے چار سو میں
نہ چھوڑ اے دل فغان صبح گاہی | اماں شاید ملے اللہ ہو میں

خودی کا سر نہاں لا الہ الا اللہ

خودی ہے تیغ فساں لا الہ الا اللہ

یہ دور اپنے براہیم کی تلاش میں ہے

صنم کدہ ہے جہاں لا الہ الا اللہ

خرد ہوئی ہے زمان و مکاں کی زناری

نہ ہے زماں و مکاں لا الہ الا اللہ

نقطۂ ادوار عالم لا الہ | منتہائے کار عالم لا الہ
تا ز رمز لا الہ آید بدست | بند غیر اللہ را نتواں شکست

یعنی عالم کا آخری مبدا و منشا لا الہ ہے اور جب تک رمز توحید پوری طرح گرفت میں نہ آئے غیر اللہ سے چھٹکارا مل ہی نہیں سکتا۔ حدیث شریف ہے کہ تفکروا فی الخلق ولا تفکروا فی الخالق۔ (مخلوق کے متعلق غور کرو اور خالق کی بابت غور و فکر مت کرو) خلق پر غور تسخیر حیات کی ضمانت ہے لیکن خالق کا علم سرحد ادراک سے پرے ہے۔ اس

کا وجدانی تجربے کے ذریعہ ہی احساس ممکن ہے۔" اسی کو اپنے اشعار میں اقبال نے چمکتے موتیوں کی طرح پرو دیا ہے۔ اور جن کی مثالیں اوپر دی گئیں۔ اقبال کا یہ بھی خیال ہے کہ معرفتِ نفس کے بغیر معرفتِ الٰہی ممکن نہیں ہے۔ اور یہ پرانا مقولہ ہے کہ جس نے اپنے نفس کو پہچانا اس نے خدا کو پہچانا۔

اسرارِ ازل جوئی بر خود نظرے وا کن　　یکتائی و بسیاری پنہانی و پیدائی

ز ملا نہ با صوفی نشینم　　تو می دانی کہ من آنم نہ اینم

نویس اللہ بر لوحِ دلِ من　　کہ ہم خود را ہم او را فاش بینم

(میں نہ تو ملا ہوں اور نہ صوفی ہوں اور یہ، تجھ کو معلوم ہے لیکن اپنے کو اور خدا کو صاف دیکھتا ہوں۔ اس لئے میرے لوحِ دل پر اللہ کو کندہ کردو) معرفتِ نفس سے معرفتِ الٰہی کے حصول کو کن خوبصورت الفاظ میں بیان کیا ہے۔ اسی طرح سرگذشتِ آدم میں انسان کی تسخیر کے عالم آرا کرشمے بیان کرنے کے بعد کہتا ہے کہ عقل کی وسیع فتح یابیوں نے رازِ کائنات وا نہیں کیا لیکن جب اس سے اجتناب کرکے وجدان و عشق کے میدان میں آئے تو ذاتِ باری تعالیٰ کو دل میں موجود پایا۔

کشش کا راز ہویدا کیا زمانے پر　　لگا کے آئینۂ عقلِ دور بیں میں نے

کیا اسیر شعاعوں کو برقِ مضطر کو　　بنا دی غیرتِ جنت یہ سرزمیں میں نے

مگر خبر نہ ملی آہ رازِ ہستی کی　　کیا خرد سے جہاں کو تہِ نگیں میں نے

ہوئی جو چشمِ مظاہر پرست وا آخر
تو پایا خانۂ دل میں اسے مکیں میں نے

معرفتِ نفس یا احساس خودی کے بغیر وہ تمام عبادتوں اور

ریاضتوں کو بیکار تصور کرتا ہے کیونکہ صحیح معنوں میں توحید کا احساس خودی ممکن ہی نہیں ہے اور عقل کے حدود حواس تک معین و محدود ہیں۔

یہ ذکر نیم شبی یہ مراقبے یہ سرور — تری خودی کے نگہباں نہیں تو کچھ بھی نہیں
یہ عقل جو مہ و پرویں کا کھیلتی ہے شکار — شریک شورش پنہاں نہیں تو کچھ بھی نہیں

ز رازِ معنیِ قرآں چہ پرسی — ضمیرِ ما بہ آیاتش دلیل است
خرد آتش فروزد دل بسوزد — ہمیں تفسیر نمرود و خلیل است

اقبال توحید الٰہی کو کائنات کی سب سے بڑی سچائی گردانتا ہے۔ اور اس کا خیال ہے کہ توحید کے مکمل ہونے کے بعد ہی انسان کا کاسۂ جام جم بن جاتا ہے۔ اس کے پہلے وہ ایک کاسۂ گدائی تھا۔

چوں مقام عبدہ محکم شود
کاسۂ دریوزہ جام جم شود

یہ ارکانِ اساسی ملیہ اسلام میں رکن اول ہے۔ اور جب انسان کائنات کے اس راز کو پالیتا ہے تو خوف اور شک دونوں فنا ہو جاتے ہیں اور اس کی آنکھ ضمیر کائنات کو دیکھنے لگتی ہے جو عقل کی رہنمائی میں ناممکن ہے۔

بیم و شک میرد عمل گیرد حیات — چشم می بیند ضمیر کائنات

ملت بیضا تن ہے اور لا الٰہ اس کی جان ہے۔ ہمارے ساز کے پردوں کو ہلا کر آواز پیدا کرنا لا الٰہ ہی کا کام ہے۔

ملت بیضا تن و جاں لا الٰہ — ساز ما را پردہ گرداں لا الٰہ

توحید سے مساوات انسانی عالم آشکارا ہوتی ہے اور کالے اور گورے کا فرق مٹ جاتا ہے اور اس کی قوت سے ایک حبشی حضرت عمر فاروقؓ

جیسے مدبر و جہانبان اور حضرت ابوذر غفاریؓ جیسے درویش کا عزیز و دوستدار بن جاتا ہے۔

اسود از توحید احمر می شود　　خویش فاروق و ابوذر می شود

توحید یاس و حزن و خوف کو جو ام الخبائث ہیں ان کا ازالہ کرتا ہے۔

اے کہ در زندانِ غم باشی اسیر　　از نبی تعلیم لا تحزن بگیر

موحد کو کسی قسم کا غم نہ ہونا چاہیے کیونکہ اللہ تعالیٰ ہر وقت اس کے ساتھ ہے نبی پاک صلعم جب ہجرت کے لئے نکلے تو راستہ کوہ کے ایک درہ میں پناہ لی۔ دشمنانِ دین آپ کو تلاش کرنے نکلے تو قریب آ گئے حضرت ابوبکر صدیقؓ ساتھ تھے۔ وہ گھبرا گئے تھے تو آپ فرمانے لگے کہ مت ڈرو اللہ تعالیٰ ہمارے ساتھ ہے۔ اسی کو اقبال بیان کرتا ہے اور کہتا ہے کہ اگر تم غم میں گرفتار ہو تو نبی علیہ السلام سے لاتحزن کا سبق لو۔ اور یاد رکھو کہ تم موحد ہو اور اللہ تعالیٰ ہمہ وقت تمہارے ساتھ ہے۔ اگر خدا پر عقیدہ محکم ہے تو غم سے آزاد ہو جاؤ اور بیش و کم کے خیال سے آزادی حاصل کر لو۔

گر خدا داری ز غم آزاد شو
از خیالِ بیش و کم آزاد شو

خوف سے خوشامد مکاری کینہ اور جھوٹ جیسے امراض فروغ پاتے ہیں۔ اور جس نے پیغام مصطفویؐ (یعنی اسلام) کو سمجھا ہے وہ خوف کو شرکِ خفی قرار دیتا ہے۔

لابہ و مکاری و کین و دروغ　　این ہمہ از خوف می گیرد فروغ
ہر کہ رمزِ مصطفےٰ فہمیدہ است　　شرک را در خوف مضمر دیدہ است

الغرض اقبال کا نظریہ توحید کوئی نیا یا انوکھا نہیں وہی ہے جو جناب رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم لائے اور جس کی آپ نے تعلیم دی جو صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین نے مانا اور برتا اور جس پر عمل کیا۔ جس پر درویشوں، بزرگوں اور محدثین کا یقین کامل تھا۔ اور جو صاف اور واضح ہے۔ جب سے انسان کا وجود ہے۔ وہ ایک قادر مطلق خالق اور ماوراء المحسوسات لامکان ولا زمان ہستی کی تلاش میں رہا ہے تاکہ اس کے آگے سر تسلیم خم کر سکے۔ اور اس کی ذات وصفات سے عشق ومحبت کا اظہار کرے۔ منطقی دلائل اور فلسفے مذہبی عقائد اور تیقنات بکھرے پڑے ہیں۔ عرب کے وادی غیر ذی زرع سے ایک تجلی ایک روشنی نمودار ہوئی جو عالم پر چھا گئی۔ مولانا ظفر علی خان نے کہا ہے ؎

جو فلسفیوں سے کھل نہ سکا اور نکتہ وروں سے حل نہ ہوا
وہ راز اک کملی والے نے بتلا دیا چند اشاروں میں

توحید کا جو نکتہ ریگ زار عرب کے ایک امی نے بتلایا اس نے حقیقت کو اس طرح آشکارا کر دیا جس طرح بادلوں سے چاند نمودار ہو جائے۔ اقبال اسی تعلیم کو پیش کرتا ہے نہ وہ فلسفیانہ دلائل دیتا ہے نہ منطقی بحثیں کرتا ہے۔ بلکہ عقل سے کنارہ کش ہو کر وجدان سے مدد لینے کا محرک ہے اور نہ اس کے اظہار وبیان میں کسی قسم کی پیچیدگی ہے صرف حسن کلام کی خوبیاں ہیں وہ کہتا ہے کہ انسان کی آخری منزل اللہ تعالیٰ ہے ؎

در صید کمند من جبریل زبوں صیدے
یزداں بکمند آور اے ہمت مردانہ

یعنی اگر جبریل تک پہنچے تو کیا ہوا۔ اللہ تعالیٰ تک پہنچنا ہے اور

اسے دل میں بسانا ہے۔ یہ اور بات ہے کہ ہر ہر قدم پہ اقبال کے کلام میں حسنِ تخیل، طرزِ ادا کی ندرت اور شاعرانہ محاکات ملتے ہیں جو دل پر چوٹ کرتے ہیں۔ لیکن یہی ان کا اندازِ بیان ہے جو اسے ممتاز کرتا ہے ورنہ بات وہ وہی کہتا ہے جو ایک ٹھیٹھ ملا کہتا ہے اور جیسا کہ اس نے اسرارِ خودی کے شروع میں کہا ہے۔ وہ مولانا روم رحمۃ اللہ علیہ کا مقلد ہے اور عصرِ حاضر کی زبان میں اسلام کو اس طرح پیش کرتا ہے جس طرح اپنے زمانے میں مولانا روم نے پیش کیا تھا ؎

شعلہ در گیرد بخس و خاشاکِ من
مرشدِ رومی کہ گفت "منزلِ ما کبریاست"

یعنی مرشد رومی نے جب یہ کہہ دیا کہ ہماری منزل اللہ تعالیٰ ہے تو اس سے میرے خس و خاشاک میں گویا ایک شعلہ آگیا۔

چوں رومی در حرم دادم اذاں من　　از و آموختم اسرارِ جاں من
به دورِ فتنۂ عصرِ کہن او　　به دورِ فتنۂ عصرِ رواں من

یعنی رومی کی طرح میں نے بھی حرم میں اذان دی اور رومی ہی سے میں نے اسرارِ جاں کا سبق سیکھا اپنے زمانے کے دورِ فتنہ کے دفعیہ کے لئے وہ تھے اور عصرِ رواں کے دورِ فتنہ کے لئے میں ہوں۔

رسالت

اسلام ایک ضابطۂ حیات ہے اور زندگی کو ایک وحدت قرار دیتا ہے اسلام عقاید و اعمال کا مجموعہ ہے اور حیاتِ انسانی کا کوئی شعبہ خواہ وہ معاشرت سے تعلق رکھتا ہو یا سیاست سے۔ اس کے دائرہ عمل سے باہر

نہیں ہے۔ اسلام نے زندگی کے لئے قوانین و ضوابط مرتب کئے ہیں جن سے پتہ چلتا ہے کہ اسلام کو دنیا کے سامنے پیش کرنے والا واقعی فطرتِ انسانی کے رموز کا آشنا ہے کیونکہ اسے فطرتِ انسانی کے خالق نے ہی یہ سب باتیں بتلائی اور سکھائی ہیں۔ اس کا نام رسالت یا پیغمبری ہے۔ رسالت کا تعلق صرف عبادات سے نہیں بلکہ معاملات سے خواہ وہ کسی قسم کے ہوں اسی طرح ہے جس طرح کہ اللہ تعالیٰ کے سامنے سر خم کرنے سے ہے۔ عبادات و معاملات دونوں کا منشا خالقِ موجودات سے اپنا تعلق جوڑنا اور رشتۂ عبد و معبود کو مستحکم کرنا ہے۔ سب سے پہلی بات یہ ہے کہ رسالت کے ڈانڈے الوہیت سے یا اصل نہیں ملتے بلکہ رسول اپنی صرف ایک بشر ہوتا ہے۔ فرق صرف یہ ہے کہ اس پر وحی آتی ہے اور وہ خدا سے کلام کرتا ہے۔ اور اس سے احکام حاصل کر کے نوعِ انسانی کو یا جس پر وہ مامور ہو ان کے پاس پہنچاتا ہے۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ اس سلسلہ کے قدیم عقائد کیا ہیں جو شروع سے چلے آ رہے ہیں اور جن میں کسی قسم کا ابہام یا اختلاف کبھی پیدا نہیں ہوا۔ متفقہ طور پر یہ تسلیم ہے کہ کسب سے یا عبادت و ریاضت پاکیزگی و طہارت سے خواہ کسی قدر ایک انسان کے اندر جو ہوں کوئی شخص نبی نہیں ہو سکتا۔ نبی مبعوث من اللہ ہوتا ہے نبی بطنِ مادر میں بھی نبی ہوتا ہے اور وہ اللہ تعالیٰ کی حفاظت میں رہتا ہے۔ اس لئے وہ معصوم ہوتا ہے۔ اس سے کسی قسم کا گناہ سرزد ہو ہی نہیں سکتا۔ انبیائے کرام کے مدارج ہیں۔ ان کو ایک خاص وقت اور ایک خاص خطہ ارضی کے لئے نبی بنایا جاتا ہے اور یہ بات اس طرح سمجھ میں آ سکتی ہے کہ نبی تو ابتدائے آفرینش سے انسانوں کو نیک بنانے اور ان کو رموزِ حیات سمجھانے اور ضلالت

اخلاق عطا کرنے کے لئے آتے رہے۔ ایک وقت تھا کہ انسان دریا پار کرنا نہیں جانتا تھا تو اگر ایک شخص ایک ایسے مقام کا نبی بنا دیا جاتا جو دریا کے دونوں طرف واقع ہوتا تو آخر وہ کیسے اپنا پیغام انسانوں تک پہنچاتا۔ اس لئے دریا کے اس پار ایک نبی اور دریا کے دوسری طرف دوسرا نبی ہوتا تھا۔ اس طرح جو پیغام وہ لاتے تھے یا جو ضابطہ حیات وہ پیش کرتے تھے۔ وہ ایک وقت یا زمانہ کے ساتھ محدود ہوتا تھا اور اس کے بعد دوسرا نبی آتا تھا اور پیغام بدل جاتا تھا۔ احکام میں تبدیلی ہو جاتی تھی۔ ذہن انسانی کی جہاں تک رسائی تھی اور تمدن نے جس حد تک ترقی کی تھی ان کے لحاظ ہی سے احکام دیئے جاتے تھے حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے کہا کہ میں یہود کی کھوئی ہوئی بھیڑوں کے لئے بھیجا گیا ہوں۔ کچھ انبیائے کرام کے تذکرے کلام پاک میں درج ہیں اور بہت سے لوگوں کا تذکرہ نہیں آیا۔ جن کا تذکرہ نہیں آیا اور وہ خاتم النبیین سے پہلے تھے۔ ان کا علم ہم کو نہیں ہے۔ اگرچہ یہ طے شدہ ہے کہ خشک و تر کوئی مقام ایسا نہیں ہے جہاں پیغمبر نہ آئے ہوں۔ کرہ ارضی کے ہر قطعہ پر اور ہر زمانے کے ہر دور میں انبیاء علیہم السلام آتے رہے ہیں اور پیغام ربانی اپنے امتیوں کو سناتے رہے ہیں۔ بعض لوگ سوال کرتے ہیں کہ کلام پاک نے عرب کے علاوہ دیگر ممالک کے نبیوں کا حال کیوں درج نہیں ہے۔ اس کے پیچھے ایک گہرا فلسفہ ہے لیکن سادہ سی بات یہ ہے کہ قرآن شریف کوئی تاریخ یا جغرافیہ کی کتاب نہیں ہے بلکہ تہذیب نفس اور اصلاح اخلاق کا قانون ہے اور چونکہ اولین مخاطب اس کے اہل عرب تھے اس لئے وہیں کے انبیاء کا تذکرہ کیا گیا۔ یہ تذکرے تاریخی

ولایت کے طور پر نہیں ہیں بلکہ روحانیت اخلاق اعلیٰ اور تزکیۂ نفس کے لئے مثالیں ہیں اور مثالیں کہیں سے بھی لی جا سکتی ہیں مگر وہ ایسی ہونی چاہئیں جو ذہنوں کو متاثر کر سکیں اور دماغوں پر چھا جائیں تاکہ ان سے پورا نفع حاصل ہو سکے سب سے آخر میں افضل البشر خاتم النبیین احمد مجتبیٰ محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم مبعوث کئے گئے۔ آپ آخری نبی تھے اور آپ کا پیغام آخری پیغام تھا اور آپ کل ہی نوع انسان کی ہدایت کے لئے بھیجے گئے تھے۔ آپ بشر تھے اور آپ کا سب سے بڑا درجہ یہ تھا کہ آپ عبد تھے چنانچہ معراج مبارک جو آپ کی منزلت شان کی سب سے بڑی دلیل ہے۔ اس کا تذکرہ کرتے ہوئے قرآن نے آپ کی رفعت و علو مرتبت کا اظہار پیغمبر یا نبی کے لفظ سے نہیں بلکہ عبد کے لفظ سے کیا ہے۔ سُبْحَانَ الَّذِیْ اَسْرٰی بِعَبْدِہٖ لَیْلًا مِّنَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ اِلَی الْمَسْجِدِ الْاَقْصٰی

(پاک ہے وہ ذات جو لے گئی اپنے بندے کو رات میں مسجد سے مسجد اقصیٰ تک) اسی طرح جو کلمہ خلاصہ کائنات ہے۔ اس میں آپ کو عبدہٗ کہا گیا اور اس کے بعد رسول کہا گیا یعنی عبدہ کا لفظ پہلے آیا اور رسول کا لفظ بعد کو۔ آپ تمام دنیا کے انسانوں میں سب سے اعلیٰ و ارفع تھے۔ آپ کی ذات ستودہ صفات نیک کرداروں کے لئے اسوۂ حسنہ ہے۔ آپ کا اخلاق قرآن کے مقدس احکام کی تشریح ہے۔ آپ سے بہتر انسان پر یہ آفتاب کبھی طلوع نہیں ہوا۔ آپ سے محبت اللہ کے تقرب کا حصول کا ذریعہ ہے۔ باپ ماں بھائی اولاد سب سے زیادہ آپ سے محبت کرنا اور ان سب کو آپ پر قربان کرنے کے لئے تیار رہنا ہر مومن

کا خاصہ ہے۔ اور اگر اس میں کمی ہو تو ایمان میں کمی ہے۔ "عشقِ رسول" سب سے اعلیٰ درجہ عبدیت کا ہے۔ یہ ہیں مختصراً وہ عقائد جو بلا اختلاف اسلام کے ہر فرقے کے اندر موجود ہیں اور جو خالص اسلامی تعلیم ہے۔ اقبال کا نظریہ بھی یہی ہے جو اوپر بیان کیا گیا۔ البتہ جیسا کہ بار بار کہا گیا وہ عصرِ حاضر کے تقاضوں کے تحت اور اپنی شاعرانہ عظمت کے شان سے ان باتوں کو اندازِ نو میں بیان کرتا ہے۔ لیکن جب میں مثالیں دوں گا تو ظاہر ہو جائے گا کہ اس کے کلام میں کسی قسم کا ابہام نہیں ہے۔

بشر

بعض لوگ کم فہمی کی وجہ سے بشر یا انسان کے لفظ کو نبی پاک صلعم کے لئے مناسب تصور نہیں کرتے۔ حالانکہ خود قرآن پاک میں آیا ہے کہ قُلْ اِنَّمَا اَنَا بَشَرٌ مِّثْلُکُمْ یُوْحٰی اِلَیَّ (کہہ دو کہ میں بھی تمہاری طرح ایک بشر ہوں۔ البتہ مجھ پر وحی آتی ہے)۔ اس لئے ضرورت لاحق ہوئی کہ رسالت کے موضوع پر کچھ اور کہنے سے پہلے انسان کا جو درجہ اسلام کے اندر ہے اسے واضح کر دیا جائے۔ اس کی ضرورت اس وجہ سے بھی ہے کہ بعض شعراء نے نعت گوئی میں بشر سے گریز کرنے میں مبالغہ کر دیا ہے جو قطعی حکمِ الٰہی اور تادیبِ نبوی کے خلاف ہے۔ مثلاً ایک صاحب فرماتے ہیں۔

محمد سرِ وحدت ہے کوئی رمز اس کا کیا جانے
شریعت میں تو بندہ ہے حقیقت میں خدا جانے

یا

اتر گیا ہے مدینہ میں مصطفےٰ بن کر

یا

میرے بچپن میں ریکارڈ پر ایک گیت گایا جاتا تھا اور لوگ شوق

سے سنتے تھے ۔ وہ بھی اسی قسم کا ہے ۔

مدینہ میں مورے پیا بالا ہے رے

عمامہ کھڑے باندھتے تھے شاہ دل نواز — جبریل نے فرمایا کہ اے ہمدم و ہمساز
پردہ کو اٹھا دیکھو تو پوشیدہ کیا ہے راز

جبریل نے کی عرض کہ قدرت مجھے کیا ہے — محبوب نے فرمایا کہ جا میری رضا ہے
پردہ جو اٹھا تو نہ وہاں آیا نظر کچھ — جو کچھ کہ یہاں تھا وہ وہاں پر جو وہاں تھا وہ یہاں تھا
پردہ پر خدا ہے نہیں محبوب کھڑا ہے — عمامہ اسی طرح کھڑا باندھتا ہے

مدینہ میں مورے پیا بالا ہے رے

والہانہ عشق و محبت حدود متعینہ سے گریز کر کے خلاف اصول باتیں کرنے لگتا ہے بعض اشعار نعتیہ اور گیتوں میں ملے گا جن کی کوئی اصولی حیثیت نہیں ہے ۔ اسلام کا کوئی فرقہ ایسا نہیں ہے جو نبوت کے ساتھ الوہیت شامل کر کے پیغمبر کے اوتار کا عقیدہ ۔ اسلام کے کسی فرقہ میں نہیں پایا جاتا ہے ۔ اسلام اس سے قطعی نا آشنا ہے ۔ اسلام نے نبی اور پیغمبر کو صرف بشر قرار دیا ہے ۔ جو لوگ حد سے متجاوز ہو گئے وہ بھی سمجھتے ہیں کہ یہ حد سے تجاوز ہے ۔ اسلام ایک مدون و مرتب قانون کی شکل رکھتا ہے اور ہر مسئلہ کے لئے فتویٰ صادر ہوتا ہے جو مستند علمائے کرام دیتے ہیں ۔ وہی اصل عقیدہ ہے ۔ اگر کسی فرقے کے کسی عالم مستند سے فتویٰ دریافت کیا جائے تو وہ قرآن کی نص صریح جس میں لفظ بشر آیا ہے اور کلمہ شہادت جس کا ہر مسلمان آپ کو عبد کہتا ہے ۔ اس کے خلاف کیا کہہ سکتا ہے ۔ ہندوستان غیر ذمہ دارانہ شعری باتوں سے کوئی اثر قبول کرنا غلط اور خلاف الذات ہو گا ۔ یہ بات ایسی نہیں تھی جس کا نوٹس لیا جاتا یا اسے قابل بحث قرار دیا جاتا ۔ لیکن میری زندگی میں ایک واقعہ پیش آیا جس سے میں نے اس کی ضرورت

محسوس کی۔ عرصہ ہوا بستی میں ایک سول جج ضمیر الاسلام تھے۔ اسی زمانے میں ایک منصف کرشن چندر نام کے تھے جو صوفی تھے اور جن کا دعویٰ تھا کہ ان کو مسلمان بزرگوں سے بھی فیض حاصل ہوتا ہے۔ وہ اپنے وارداتِ قلب کے واقعات اکثر بیان کیا کرتے تھے۔ ضمیر اسلام صاحب بی۔ ایس۔ سی منکرِ خدا تھے مگر کچھ ایسے واقعات پیش آئے جن سے ان میں انقلاب آگیا۔ اور وہ برابر بزرگانِ دین کے مزارات پر جایا کرتے تھے۔ چنانچہ بستی کے وکلا کو لے کر وہ اجمیر شریف ہو آگئے تھے۔ ضمیر اسلام نے مجھ سے کہا کہ میں ایک جلسہ جو ہندو مسلمانوں کا مخلوط ہو طلب کروں اور اس میں کسی عالم سے اسلامی تصوف پر تقریر کراؤں۔ چنانچہ میں نے شیخ کرم حسین صاحب مختار کی کوٹھی کے صحن میں ایک جلسہ طلب کیا جس میں حکام اور وکلا اور پبلک کے ممتاز حضرات شریک ہوئے۔ اس جلسے کی صدارت پنڈت کیشور پرشاد نے کی جو بستی کے ایک ممتاز اور چوٹی کے وکیل تھے۔ تقریر کے لئے میں نے آزاد سبحانی کو تکلیف دی اور اس خیال سے کہ وہ ایک فلسفی بھی تھے اور صوفی بھی اور عالم بھی۔ اور مقرر تو لاثانی تھے۔ مولانا آزاد سبحانی نے اپنی تقریر کے دوران میں سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کا تذکرہ کرتے ہوئے کہا کہ علما کہتے ہیں کہ آپ کا نور نورِ الٰہی سے بنا تھا اور صوفیہ کہتے ہیں کہ خود خدا محمد کی شکل میں نمودار ہوا تھا اور میں دونوں میں تطبیق کرتا ہوں۔ بس ایک سناٹا چھا گیا اور مسلمانوں میں سخت ہیجان پیدا ہوا۔ مجھ سے ضمیر الاسلام صاحب نے کہا کہ یہ مولانا نے کیا تقریر کر دی اور اس کی کیا اصل ہے۔ ایسی غلط بات کیوں کہی گئی۔ اتفاقاً اسی زمانے میں مولانا آزاد سبحانی کے پیر مولانا ضیاء الدین صاحب بہرائچی رحمۃ اللہ علیہ بستی آئے ہوئے تھے اور

ظفر صاحب وکیل کے ہاں ٹھہرے تھے۔ میں ان کی خدمت میں حاضر ہوا اور واقعہ بیان کیا اور پوچھا کہ اس کی اصلیت کیا ہے اللہ اکبر!

مولانا کے چہرے پر غضب کا جلال نمودار ہوا آنکھیں سرخ ہو گئیں۔ چہرہ تمتما اٹھا اور ڈپٹ کر مجھ سے کہا کہ پڑھو کلمۂ شہادت۔ اشہد ان لا الٰہ الا اللہ و اشہد ان محمداً عبدہٗ بس یہیں تک پہنچا تھا کہ وہ گرجے رک جاؤ۔ میں خاموش ہو گیا تو فرمایا کہ عبدہٗ پر عقیدہ ہے یا نہیں۔ میں نے کہا کہ ہے تو کہا پھر کیوں مجھ سے سوال کیا۔ اسلام کے بنیادی مسائل، عقاید پر سوال کے کیا معنی۔ اور پھر فرمایا کہ ایک صوفی بہلول گذرے ہیں انھوں نے کہا ہے کہ من از بیش خدا ام دہ سال یعنی میں اللہ تعالیٰ سے دس سال قبل سے ہوں ان پاگلوں کے پیچھے ہم کہاں تک گھومتے پھریں گے۔ میں چپ تھا۔ آخر فرمایا کہ جاؤ۔ کبھی اس طرح کے معاملات میں سوال نہ کرنا اور نہ کسی قسم کا شک لانا۔

اس سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ آپ کی بشریت کس درجہ مسلم ہے۔ مولانا ضیاء الدین بھوپالی رحمۃ اللہ علیہ نہ صرف ایک عالم دین بلکہ ایک صاحب نسبت بزرگ اور صوفی بھی تھے۔ لیکن اسلام کا عقیدہ اس معاملے میں اس درجہ واضح اور روشن ہے کہ کسی قسم کے شک یا ابہام کی اس میں گنجائش نہیں ہے۔ اور کیوں نہ ہو جب نص صریح اس پر شاہد ہے اور کلمۂ شہادت کے اندر اس کا تذکرہ ہے اس کے خلاف کسی کو لب کشائی کی گنجائش کہاں ہے۔ اس سے قبل میں توحید کی بحث میں مولانا ابوالکلام آزاد کا قول نقل کر چکا ہوں۔ جس سے واضح ہے کہ یہ مسئلہ مسلمات دین میں سے ہے مولانا کا وہ قول یہاں پھر دوہرا دینا مناسب معلوم ہوتا ہے فرماتے ہیں:

"یہی وجہ ہے کہ ہم دیکھتے ہیں کہ پیغمبر اسلام کی وفات کے بعد مسلمانوں میں بہت سے اختلافات پیدا ہوئے لیکن ان کی شخصیت کے بارے میں کوئی سوال پیدا نہیں ہوا ابھی آپ کی وفات پر چند گھنٹے بھی نہ گذرے تھے کہ حضرت ابوبکر صدیق نے سر منبر اعلان کر دیا تھا۔

"جو کوئی تم میں محمد (صلعم) کی پرستش کرتا تھا سو اسے معلوم ہونا چاہیے کہ محمد (صلعم) نے وفات پائی اور جو کوئی تم میں اللہ کی پرستش کرتا تھا تو اسے معلوم ہونا چاہیے کہ اللہ کی ذات ہمیشہ زندہ ہے اسے موت نہیں ہے"

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو انسان کہنے میں بعض پروانہ شمع نبوت نے اپنے والہانہ عشق میں جو باک محسوس کی اس کی وجہ یہ تھی کہ انھوں نے انسان کے درجے کو نہیں پہچانا، انسان کی فرمانیاں اس کے جرائم شدید اس کے اخلاق کی گراوٹ جو عام ہوتی جاتی ہے ان سے انسان کو کمتر سمجھ لیا گیا۔ حالانکہ انسان اشرف المخلوقات ہے اور یہ لقب اسے بھی لوگ دیتے ہیں لیکن اس کے دور رس تقاضوں کو کبھی کبھی بھول جاتے ہیں۔ مولانا حالی نے کہا ہے کہ

فرشتہ سے بڑھ کر انسان ہونا مگر اس میں پڑتی ہے محنت زیادہ

انسان کا درجہ اسلام میں بہت بلند ہے۔ وہ براہ راست خدا سے کلام کر سکتا ہے اسے کسی وسیلے یا ذریعہ کی ضرورت نہیں ہر انسان جو اپنی خودی کو بلند کرے وہ اللہ تعالیٰ سے کلام کر سکتا ہے آج بھی کر سکتا ہے البتہ احکام حاصل کرنا صرف انبیاء کرام کا کام ہے۔ ہر انسان کا یہ حق نہیں ہے کہ وہ ہدایت اور رشد کے احکام اللہ تعالیٰ سے حاصل کرے منصب

صرف پیغمبروں کا ہے اور یہی فرق ہے انسان اور پیغمبر میں۔ چنانچہ اقبال
نے سب سے پہلے "انسان" کے درجہ کی وضاحت کی ہے جو عام طور پر
لوگ بھول گئے تھے کہتا ہے۔

بجبریلِ امیں ہم داستانم — رقیب و قاصد و درباں ندانم

یعنی جس طرح ناموس اکبر حضرت جبریل علیہ السلام براہ راست
اللہ تعالیٰ سے پیغام لاتے تھے میں بھی ایک انسان کی حیثیت سے اللہ
تعالیٰ سے کلام کرتا ہوں۔ رقیب و قاصد و درباں سے ناآشنا ہوں
اصل غرض تو اقبال کی یہ ہے کہ ان کا پیغام خاص الخاص اسلام کا نچوڑ
ہے اس میں کسی قسم کی آمیزش نہیں لیکن اس سے انسان کے مدارج کا
بھی پتہ چلتا ہے۔ یہ تو دکھلایا جا چکا کہ انسان کائنات کو مسخر کر سکتا ہے اور
اپنے قبضہ میں لا سکتا ہے۔ چونکہ اللہ تعالیٰ نے کسی اور مخلوق حتیٰ کہ فرشتوں
کو بھی یہ درجہ نہیں دیا۔ تو ظاہر ہے کہ اس کے مدارج روحانیہ بھی اسی حد
تک بلند ہوں گے۔ کیونکہ عطاء خاص مقربانِ خاص ہی کے لئے ہے۔

بانگ درا میں "انسان" کے عنوان سے کہا کہ

تسلیم کی خوگر ہے جو چیز ہے دنیا میں — انسان کی ہر قوت سرگرم تقاضا ہے
اس ذرہ کو رہتی ہے وسعت کی ہوس ہر دم — یہ ذرہ نہیں شاید سمٹا ہوا صحرا ہے
چاہے تو بدل ڈالے ہیئت چمنستاں کی — یہ ہستی دانا ہے بینا ہے توانا ہے

تسخیر فطرت کے عنوان سے جو ڈرامہ کی شکل میں کلام ہے "میلاد آدم"
کے ضمنی عنوان میں انسان کی اصل حیثیت کو ظاہر کیا ہے۔

نعرہ زد عشق کہ خونیں جگرے پیدا شد
حسن لرزید کہ صاحب نظرے پیدا شد

فرشتے آدم سے پہلے موجود تھے لیکن وہ حسن الٰہی کے لئے نظر نہیں رکھتے تھے۔ اور صفت عشق سے متصف نہ تھے جب آدمؑ عالم وجود میں آئے تو عشق نے نعرہ مارا کہ ایک خونین جگر پیدا ہوا یعنی وہ پیدا ہوا جو عشقِ الٰہی کا سزاوار ہے اور حسن نے سمجھا کہ صاحبِ نظر آ گیا۔ وہ اب آ گے جانے پہچانے لگا کتنا بلند مرتبہ ہے انسان کا۔

زندگی گفت کہ در خاک تپیدم ہمہ عمر
تا ازیں گنبد دیرینہ درے پیدا شد

یعنی زندگی نے کہا کہ تمام عمر میں تڑپتی رہی اب آدم کی پیدائش سے اس گنبد دیرینہ میں در پیدا ہوا۔

خبرے رفت ز گردوں بہ شبستان ازل
حذر اے پردگیاں پردہ درے پیدا شد

گردوں سے شبستانِ ازل میں یہ خبر بھیج دی گئی کہ اے پردگیاں ڈرو اب پردہ در پیدا ہو گیا یعنی انسان رموزِ معرفتِ الٰہی و رازِ کائنات کا علمبردار ہے۔

یہ ہے وہ انسان جسے اللہ تعالیٰ نے اپنے نوامیس بطورِ امانت سپرد کئے کہ وہ بنی نوعِ انسان کو صحیح راہِ عمل کی تعلیم دے یہ بات کہ ناموس اکبر خود پیغام انسانوں تک نہیں لاتے تھے اور ان کے لئے منتخب نہیں کئے گئے بلکہ وہ صرف اس لئے چنے گئے کہ اللہ تعالیٰ کا پیغام ایک منتخب بشر کو پہنچا دیں۔ اس بات کا ثبوت ہے کہ انسان کا درجہ فرشتوں سے افضل ہے اور خلاصہ کائنات وہ بشر ہے جو تمام بنی نوعِ انسان کی ہدایت کے لئے اللہ تعالیٰ کی طرف سے روزِ قیامت تک کے واسطے چنا گیا۔

نیابتِ الٰہی

نبوت نیابتِ الٰہی ہے اور اسی درجہ مخلوق کا سب سے بڑا درجہ ہے نبی صرف افراد کی ہدایت کے لیے نہیں آتا بلکہ ملت کی بھی تعمیر کرتا ہے اور افراد اور ملت میں ربط پیدا کرتا ہے۔ اسی طرح اسلام ایک طرف خانقاہی سے ممیز ہوتا ہے جو صرف فرد کے تہذیبِ نفس تک محدود ہے اور دوسری طرف کمیونزم سے جس کی نگاہ صرف قوم یا جماعت تک ہے افراد کی اخلاق و اعمالِ صالحہ اس کی حد سے باہر ہیں۔ اقبال کا طرزِ فکر یہ ہے کہ وہ اولاً ربطِ فرد و ملت پر زور دیتا ہے وہ کہتا ہے کہ:-

فرد را ربطِ جماعت رحمت است — جوہر او را کمال از ملت است

یعنی فرد کے لیے جماعت کا ربط رحمت ہے اور اس کا جوہر کمال ملت سے حاصل ہوتا ہے

حرزِ جاں کن گفتۂ خیر البشر — ہست شیطاں از جماعت دور تر

نبی پاک صلعم کے اس قول کو حرزِ جاں بناؤ کہ شیطان جماعت سے دور رہتا ہے

فرد می گیرد ز ملت احترام — ملت از افراد می یابد نظام

فرد کو ملت سے احترام ملتا ہے اور ملت فرد سے منتظم ہوتی ہے۔

پختہ تر از گرمیٔ صحبت شود — تا بمعنی فرد ہم ملت شود

گرمیٔ صحبت سے فرد پختہ تر ہو جاتا ہے حتیٰ کہ حقیقتاً خود فرد خود ملت بن جاتا ہے

فرد تنہا از مقاصد غافل است — قوتش آشفتگی را مائل است

فرد تنہا رہ کر جو مقاصد زندگی سے غافل ہو جاتا ہے۔ اور اس کی قوت پریشانی کی جانب مائل ہو جاتی ہے۔ اس کی بہت سی مثالیں دینے کے بعد اقبال کہتا ہے کہ ملت اختلاط فرد سے پیدا ہوتی ہے اور اس کی تکمیل و تربیت نبوت ہی سے ممکن ہے یعنی اگر ملت کی تربیت نوامیس الہٰیہ کے ذریعہ جو انبیاء کرام کو تفویض ہوتے ہیں نہیں ہوگی تو عالم میں خیر قائم نہ ہوگا۔

ملت کا کام افراد کو ایک رشتہ میں پرونا ہے۔

فرد قائم ربط ملت سے ہے تنہا کچھ نہیں

موج ہے دریا میں اور بیرون دریا کچھ نہیں

مردمان خوگر بیک دیگر شوند

سفتہ در یک رشتہ چون گوہر شوند

افراد ایک دوسرے سے خوگر ہو جاتے ہیں اور موتی کی طرح ایک رشتہ میں منسلک ہوتے ہیں مثال کے طور پر کہتا ہے۔

محفل انجم ز جذب باہم است

ہستی کوکب ز کوکب محکم است

ستاروں کی محفل ستاروں کے باہمی ارتباط سے سجی ہے اور ایک ستارہ دوسرے ستارے کو محکم کرتا ہے۔ انسان جماعت ملت سے لیکن نوامیس الہٰیہ کے نہ ہونے سے ایک بشر میں تبدیل ہو جاتا ہے۔ نہ آرزو نہ مقاصد اس خاک کا سبزہ خوابیدہ ہے اور اس کی رگوں میں خود سر دیو اور پری اس کے تخیلات پر چھائے رہتے ہیں۔ اور صرف گمان و وہم پر اس کے تصورات کا انحصار ہوتا ہے۔ جان کا خوف اسے گھیرے رہتا ہے۔ اور وہ تیز ہوا سے بھی ڈرتا ہے۔ محنت کوشی سے بھاگتا ہے اور دامن

فطرت پر پنجہ کم مارتا ہے۔

نو دمیدہ سبزہ خاکش ہنوز — سرد خون اندر رگ تاکش ہنوز
منزل دیو و پری اندیشہ اش — از گمان خود بمیدان پیشہ اش
تنگ میدان ہستی خاموشش ہنوز — فکر او زیر لب باتش ہنوز
ہم جاں سرمایہ آب و گلش — ہم ز باد تند می لرزد دلش
جان او سخت کوشی کم زند — پنجہ در داماں فطرت کم زند

یہ حال انسان کی بے خبری کا ہوتا ہے۔ اقبال اس دور کا تصور پیش کرتا ہے جب کوئی نائب خدا نوامیس الٰہیہ لے کر نہیں آیا۔ اس کے بعد وہ کہتا ہے کہ خدا ایک صاحبِ دل پیدا کرتا ہے اور وہ پھر وہ ایک انقلاب پیدا کر دیتا ہے۔ اقبال یہ تصور پیش کرتا ہے کہ صرف نبوت سے انسان کی جمعیت کی تعمیر ہو سکتی ہے۔ چنانچہ وہ کہتا ہے کہ جب نبی آتا ہے تو حالت ہوتی ہے کہ اس کے ساز کے دو مقامات (یعنی دین و دنیا) کی آواز سے خاک کو حیات تازہ مل جاتی ہے۔ ذرہ بے مایہ چمک اٹھتا ہے اور ہر متاعِ حیات کو جدید سرفرازی حاصل ہوتی ہے۔

ذرہ بے مایہ ضو گیرد ازو — ہر متاعے ارج او گیرد ازو

اور اسی طرح اور بہت سی مثالیں دینے کے بعد کہتا ہے

عقل عریاں را دہد پیرایہ — بخشد ایں بے مایہ را سرمایہ

عقل جو بالکل برہنہ تھی اس کو لباس عطا کرتا ہے اور اس بے مایہ کو سرمایہ بخشتا ہے۔

بندہا از پا کشاید بندہ را — از خداوندان رہاید بندہ را

بندوں کے پیر سے غلامی کی زنجیریں کاٹ ڈالتا ہے اور جو خداوند

بندوں نے بنا رکھے تھے ان سے نجات دلاتا ہے۔

نکتۂ توحید باز آموزدش — رسم و آئین نیاز آموزدش

از سرِ نو نکتۂ توحید سکھاتا ہے اور بارگاہِ رب العزت رسم آئین نیاز کی تعلیم دیتا ہے۔

یہ نیابتِ الٰہی کا درجہ ہے اور اسی سے بنی نوع انسان کی راہِ ہدایت متعین ہوتی ہے۔ وہ راہِ ہدایت اعمالِ انفرادی کے لئے اسی طرح متعین کی جاتی ہے جس طرح کہ جماعت یا قوم یا ملت کے لئے اور اسی کو عرفِ عام میں یا شرع کی زبان میں "حزب اللہ" کہا گیا ہے۔ یعنی عالم کی ایک ایسی منظم تربیت یافتہ جماعت جو نیکیوں سے بنی ہوا اور جن کے انفرادی اعمال نیکی مجاہدت فیاضی عفو و کرم پر مبنی ہوں اور جو جماعت دنیا میں امر بالمعروف و نہی عن المنکر کے فرائض انجام دیتے ہوئے امن و سلامتی خوش حالی اور خوش بختی قائم کرے اور جہاں جہاں ظلم یا ناانصافی ہو اس کو مٹانے کے لئے جان و مال کی قربانی پیش کرے بلا لحاظ مذہب و ملت اور ملک و قوم دنیا کے جس حصے میں زیادتی یا حق و عدالت کے خلاف کوئی اٹھے اس سے حزب اللہ کا جہاد کرنا اور سرگرم عمل ہو جانا فرض ہے۔ اور اسی طرح کی ایک عالمی تنظیم جسے خلافت کبریٰ کہہ سکتے ہیں اور جس کی اساس نوامیس الٰہیہ پر ہوگی۔ اسلام کی تعلیم اور اقبال کا نظریہ ہے۔ ؎

سبق پھر پڑھ صداقت کا عدالت کا شجاعت کا
لیا جائے گا تجھ سے کام دنیا کی امامت کا

اس لئے جہاد محض رضائے حق کے لئے ہے اور اگر اس کا محرک جوع الارض ہو تو مذہب اسلام میں حرام ہے۔

ہو کر خنجر بجز غیر اللہ کشید — تیغ او در سینۂ او آرمید

یعنی جس نے رضاء حق کے علاوہ کسی اور غرض سے تلوار کھینچی اسکی تیغ اس کے سینہ میں پیوست ہو گئی۔

ملا جمال الدین افغانی اور اقبال

ملا جمال الدین افغانی کے ساتھ تحریک اتحاد اسلام وابستہ کی جاتی ہے اور اس کو بھی حیلہ جویان فرنگ نے جدید رنگ و روغن دے کر اس کے خط وخال کو بدل دیا اور یہ کہہ دیا کہ ملا جمال الدین افغانی تمام دنیا کے مسلم سلطنتوں کو متحد کر کے عالم پر حکمرانی کا خواب دیکھتا تھا حالانکہ ملا ممدوح کا ہرگز یہ منشا نہ تھا۔ وہ تو صرف اس سے متاثر تھے کہ مسلم ممالک اندرونی طور پر کمزور ہو رہے تھے۔ اور سب کے فنا ہو جانے کا اندیشہ تھا۔ اس لئے وہ یہ علم لے کر اٹھے کہ ہر مسلم ملک اپنے کو مضبوط کرے اور اس کا طریقہ یہ ہے کہ قانون اسلام کو مطابق کتاب و سنت رائج کیا جائے یہی واحد طریقہ اصلاح و ترقی کا ہے۔ اقبال کا نظریہ اس سے اس معنی میں مختلف ہے کہ وہ مقصدی باتیں کہتا ہے عملی نہیں وہ اصول سے بحث کرتا ہے۔ اقبال کا خیال ہے کہ عالم میں ایک ایسی حکومت قائم کرنا چاہئے جو قید وطن سے آزاد ہو جس کی اساس وطنیت پر نہیں بلکہ اصول و قوانین شرع پر ہو جسے اللہ تعالیٰ نے خود اپنے نبی آخر الزماں صلعم کے ذریعہ آشکارا کیا ہے۔ اور اس کے لئے وہ پکارتا ہے کہ انفرادی اعمال اور اخلاق میں مطابق احکام الہیہ انقلاب لانے کی ضرورت ہے اور پھر اس بنیاد پر جماعت کی تعمیر کرلی جائے حالات موجودہ میں وہ جماعت غیر

ہو سکے گی یا نہیں اس سے اس کو سروکار نہیں ہے وہ تو مبلغ اسلام ہے اور اسلام کے ضمیر کو اجاگر کر رہا ہے

تا خلافت کی بنا دنیا میں ہو پھر استوار
لا کہیں سے ڈھونڈ کر اسلاف کا قلب و جگر

اور وہ مایوس نہیں ہے۔ وہ سمجھتا ہے کہ جتنے ارمان اور فلسفے خواہ وہ نفسِ حیات سے تعلق رکھتے ہوں یا سیاست والے یا معاشرت سے سب میں اسلام ہی کی تعلیمات ایسی ہیں جن کی بنا پر ایسی عالمی جمعیت کی تعمیر ہو سکتی ہے کہ زمانہ خود اسے سامنے لائے گا۔ چنانچہ ابلیس کی زبان سے کہلوایا ہے

عصرِ حاضر کے تقاضاؤں سے ہے لیکن یہ خوف
ہو نہ جائے آشکارا شرعِ پیغمبر کہیں

اور پیام امید دیتا ہے کہ۔

آسماں ہوگا سحر کے نور سے آئینہ پوش
اور ظلمت رات کی سیماب پا ہو جائے گی
پھر دلوں کو یاد آ جائے گا پیغامِ سجود
پھر جبیں خاکِ حرم سے آشنا ہو جائے گی
آنکھ جو کچھ دیکھتی ہے لب پہ آ سکتا نہیں
محوِ حیرت ہوں کہ دنیا کیا سے کیا ہو جائے گی

شب گریزاں ہو گی آخر جلوۂ خورشید سے
یہ چمن معمور ہوگا نغمۂ توحید سے

خاتم النبیین

پیغمبر آخر الزماں خاتم النبیین خیر البشر امام الانبیا حبیب رب العالمین احمد مجتبیٰ محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات پاک سے اقبال کو ایسا کمال درجہ کا عشق ہے جس کی مثال ملنی مشکل ہے۔

گشتہ انداز ملا جامیم　　　نظم و نثر او علاج خامیم

ملا جامی ایک مشہور عاشق رسولؐ تھے اور انھوں نے نعت میں جو اشعار لکھے ہیں وہ انداز سخن وحدت قلب کے کمالات سے تصور کئے جاتے ہیں۔ اقبال کہتا ہے کہ ملا جامی کے انداز پر فدا ہوں اور ملا جامی نے جو نظم و نثر لکھ دی وہ میری خامیوں کا علاج ہے۔

تب و تاب بتکدۂ عجم نرسد بسوز و گداز من
کہ بیک نگاہ محمد عربی گرفت حجاز من

یعنی عرب یا اسلام سے باہر کی دنیا یعنی عجم ایک بتکدہ ہے اور اس میں بڑی تب و تاب ہے لیکن وہ میرے سوز و گداز کے مقابلے میں ہیچ ہے۔ وہاں تک اس کی رسائی نہیں۔ کیونکہ محمد عربی صلعم نے ایک نگاہ میں مجھے عجم سے حجاز تک پہنچا دیا۔

لیکن ان سب پر سیر حاصل بحث بعد کو ہوگی سر دست خاتم النبیین کے نکات کو بیان کیا جاتا ہے۔ خاتم النبیین کی مثال اس طرح ہے کہ جیسے ایک مسافر

تاریک رات میں ایک ناہموار اور پہاڑی راستہ طے کرتا ہے گھپ اندھیرا ہے
اور کچھ دکھائی نہیں دیتا۔ اچانک بجلی چمکتی ہے اور مسافر دو چار قدم آگے
بڑھتا ہے حتیٰ کہ چاند پورے آب و تاب کے ساتھ نمودار ہو جاتا ہے اور
مسافر آسانی سے اپنی منزل کی جانب رواں ہو جاتا ہے۔ آج علم اور
سائنس کا زمانہ ہے۔ سمندروں کو عبور کرنا دور دراز مقامات سے باتیں کرنا
حتیٰ کہ خلا میں پرواز کرنا اور چاند اور مریخ تک پہنچنے کی کوشش خرد انسانی
کے کمالات سے نہیں اس کے ادنیٰ کرشمے ہیں۔ آج پیغام ربانی کو پہنچانے
اور بنی نوع انسان کو ناموس الٰہیہ سے روشناس کرنے میں کسی قسم کی دقت
نہیں۔ لیکن آج پیغمبر آخر الزماں صلعم اپنی جسدی و مادی شکل میں ہمارے اندر
موجود نہیں ہیں اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ آپ کا نائب اور جانشین کون ہے۔
اقبال خاتم النبیین کے ساتھ خاتم اقوام کا بھی تخیل پیش کرتا ہے۔ وہ کہتا ہے
کہ ملت اسلامیہ نبی پاک صلعم کی نائب و جانشین ہے۔ حضرت مولانا محمد الیاس
صاحب رحمتہ اللہ علیہ نے جب تبلیغی جماعت کی بنیاد ڈالی جو اب عالم آشکارا
ہو گئی ہے۔ تو اس کے دو بڑے اصول قرار دئے۔ (۱) ایک یہ کہ ہر شخص
سے جو مانگا وہ وقت ہی مانگا اور (۲) یہ قرار دیا کہ ہر مسلمان اگر ایک کلمہ
جانتا ہے تو وہ دوسروں تک پہنچائے کیونکہ امت نبی کی جانشین ہے۔ اس
سے قبل یہی کہا جاتا تھا اور یہی سمجھا جاتا تھا کہ علماء پیغمبر اسلام کے وارث ہیں
اور اس میں یہاں تک غلو ہو گیا تھا کہ قرآن پاک اور حدیث شریف کے ترجمے
بلا امداد و نگرانی علماء ناجائز تصور کیا جاتا تھا۔ مولانا محمد الیاسؒ نے اس غلطی
پر سے پردہ اٹھایا۔ جس شخص نے سب سے پہلے آواز بلند کی وہ علامہ اقبال
تھے فرق صرف یہ ہے کہ مولانا الیاسؒ نے اسے عملاً کر کے دکھایا اور اقبال

چونکہ صرف مقصد کی باتیں کہتا ہے۔ وہ اصول بتلا کر رہ گیا چنانچہ طوالت کو نظر انداز کرنے کے لحاظ سے رموزِ بیخودی کے ابواب کے صرف عنوانات ذیل میں درج کئے جاتے ہیں جن سے اقبال کا نظریہ واضح ہو جائے گا۔

"در معنی این کہ مقصود رسالت محمدیہ تشکیل و تاسیس حریت و مساوات و اخوت بنی نوع آدم است"

یعنی کہ رسالت پیغمبر الزمان کا مقصود حریت مساوات اور بنی آدم میں اخوت قائم کرنا ہے۔

امت محمدیہ کی شان وہ یہ بتلاتا ہے کہ وہ ہر غلامی سے آزاد ہو کر صرف چراغِ مصطفےٰ صلعم کا پروانہ ہے۔ مرسل اور انبیاء اس کے بزرگ یا پیشرو ہیں۔ اور اس کا اصول۔ إِنَّ أَكْرَمَكُمْ عِندَ اللَّهِ أَتْقَاكُمْ ہے یعنی اکرم وہی ہے جو متقی ہے، ذات پات علم و دولت سے کسی کو بڑائی حاصل نہیں ہوتی صرف پاکیزگی اور اتقاء انسان کو بلند کرتا ہے۔ اس میں سب مومن بھائی بھائی ہیں اور حریت اور آزادی اس کی رگ رگ میں بھر جاتی ہے۔ امتیازات سے وہ بالاتر ہوتی ہے اور مساوات انسانی پر اس کی بنیاد قائم ہوتی ہے۔

امتے از ماسوا بیگانۂ / بر چراغِ مصطفےٰ پروانۂ
مرسلاں و انبیا آبائے او / اکرم او نزد حق اتقائے او
کُلُّ مومن اخوۃ اندر دلش / حریت سرمایۂ آب و گلش
ناشکیب امتیازات آمدہ / در نہادِ او مساوات آمدہ

اس کے بعد بطور مثال اخوت اسلامیہ کا ایک واقعہ درج کیا ہے وہ یہ ہے کہ جب ایران سے جنگ ہو رہی تھی تو شہنشاہ ایران یزدجرد کا ایک امیر جابان نامی گرفتار ہو گیا۔ اس نے امان مانگی اور ایک مسلمان سپاہی نے اسے

معمولی آدمی سمجھ کر امان دیدی۔ فتح کے بعد جب معلوم ہوا کہ یہ جابان سپہ سالار ایران ہے تو لوگوں نے اس کے قتل کا مطالبہ کیا لیکن حضرت ابو عبیدہ بن الجراح رضی اللہ عنہ اسلامی لشکر کے سپہ سالار نے کہا کہ ہم مسلمان ہیں اور ہم ایک آہنگ ہیں۔ ہمارے ہاں فیصلہ حیدر رضا کے بعد فرد اگرچہ غلام قنبر یا بلال کے حلق سے نکلے چونکہ فرد سے ملت بنتی ہے۔ اس لئے فرد کا پیمان ملت کا عہد ہے اور فرمایا کہ

گرچہ جابانِ دشمنِ ما بودہ است　　　مسلم از ما اں بخشیدہ است
خونِ اے معشرِ خیر الانام　　　بر دمِ تیغِ مسلماناں حرام

یعنی اگرچہ جابان ہمارا دشمن تھا لیکن ایک مسلمان نے اس کو امان بخش دی۔ اس لئے اے خیر الانام کے امتیو اس کا خون مسلمان کی تلوار پر حرام ہے۔ حریت اسلام کا تذکرہ کرتے ہوئے بڑے والہانہ انداز سے واقعہ کربلا اور شہادتِ حسین رضی اللہ عنہ کا ذکر کیا ہے۔ کہتا ہے کہ عشق مومن کا حصہ ہے۔ اور مومن عشق ہی سے بنا ہے۔ عقل سفاک و چالاک ہے لیکن عشق اس سے زیادہ سفاک و چالاک ہے اور اس کے ساتھ پاک تر ہے۔ عقل اسباب و علل کے بکھیڑوں میں رہتی ہے اور عشق میدان عمل کا کھلاڑی ہے۔ عقل کے ساتھ خوف اور شک لگے رہتے ہیں اور عشق کے لئے عزم و یقین لازم ہیں اور بہت سی باتیں کہنے کے بعد کہتا ہے کہ تم نے سنا ہے کہ لڑائی کے وقت عشق نے عقل ہوس پرور کے ساتھ کیا کیا۔ اس کے بعد حضرت حسین کی مدح بڑے پر شوکت الفاظ میں کرنے کے بعد کہتا ہے کہ کربلا میں حضرت حسینؓ نے قیامت کے لئے قطع استبداد کر دیا اور اپنے موجِ خون سے چمن ایجاد کیا۔

تا قیامت قطعِ استبداد کرد　　　موجِ خونِ او چمن ایجاد کرد

دوسرا عنوان ہے در معنی اینکہ چوں ملت محمدیہ بر توحید و رسالت است پس نہایت مکانی ندارد۔

یعنی ملت محمدیہ کی تشکیل اصول پر ہوئی ہے اور اس کی بنیادیں توحید اور رسالت ہیں۔ اس لئے یہ جغرافیائی حدود سے محدود نہیں ہے۔

اس کے بعد تیسرا عنوان ہے در معنی ایں کہ وطن اساس ملت نیست یعنی وطن ملت کی بنیاد نہیں ہے۔

یہ دونوں عنوانات ایک دوسرے کے اجزا ہیں۔ میں اس سے قبل بحث کر چکا ہوں کہ اقبال اصول کا مبلغ ہے۔ اور مقصدی باتیں کہتا ہے۔ عملی سیاست سے اُسے سروکار نہیں ہے۔

چوتھا عنوان ہے در معنی اینکہ ملت محمدیہ نہایت زمانی ندارد و دوام ایں ملت شریفہ موعود است۔

یعنی ملت محمدیہ کسی زمانے کے لئے مخصوص نہیں ہے۔ بلکہ قیامت تک کے لئے اس کا وعدہ منجانب اللہ تعالیٰ ہو چکا ہے۔

پانچواں عنوان " در معنی اینکہ نظام ملت محمدیہ غیر از آئین صورت نہ بندد اور آئین ملت محمدیہ قرآن است "

یعنی ملت محمدیہ کا نظام بلا آئین نہیں بن سکتا ہے اور ملت محمدیہ کا آئین قرآن ہے۔

چھٹواں عنوان در معنی اینکہ پختگی سیرت ملیہ از اتباع آئین الٰہیہ است۔

یعنی ملت کی سیرت میں پختگی آئین الٰہیہ کی اتباع ہی سے پیدا ہو سکتی ہے۔

تا شعار مصطفیٰ از دست رفت　　قوم را رمز بقا از دست رفت

یعنی جب شعار رسول صلعم کو ہاتھ سے چھوڑ دیا تب قوم سے رمز بقا جاتا

رہا مطلب یہ کہ وہ باقی ہی نہیں رہ سکتی اگر نبی پاک صلعم کے شعار پر عمل نہ کرےگی۔

ساتواں عنوان "درمعنی اینکہ حسن سیرت ملیہ از تادب بآداب محمدیہ است"
یعنی سیرت ملیہ کا حسن آداب محمدیہ کے سامنے سر جھکانے ہی میں ہے۔

آٹھواں عنوان "حیات ملیہ مرکز محسوس می خواہد و مرکز ملت اسلامیہ بیت الحرام است۔ حیات ملیہ کے لئے ایک خاص مرکز کی ضرورت ہے۔ اور ملت اسلامیہ کا مرکز بیت الحرام ہے

نواں عنوان۔ "درمعنی اینکہ توسیع حیات ملیہ از تسخیر قوائے نظام عالم است۔ یعنی حیات ملیہ کی توسیع قوائے نظام عالم کی تسخیر سے حاصل ہوتی ہے۔

علم اسما اعتبار آدم است
حکمت اشیا حصار آدم است

اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم علیہ السلام کو اسماء کا علم دیا تھا اور یہی علم بازو ہے۔ اور اس سے فرشتے عاجز نکلے اس لئے ان کو سجدہ کرنا پڑا اس لئے انسان کے گرد حکمت اشیاء کا حصار ہونا چاہئے۔

دسواں عنوان "درمعنی اینکہ کمال حیات ملیہ اینست کہ ملت مثل فرد احساس خودی پیدا کند و تولید و تکمیل ایں احساس از ضبط روایات ملیہ ممکن است"

یعنی حیات ملیہ کا کمال یہ ہے کہ ملت فرد کی طرح اپنے اندر احساس خودی پیدا کرے اور آشکارا ہو اور یہ احساس اسی وقت ممکن ہے جب روایات ملیہ منضبط کئے جائیں۔ گیارھواں اور آخری عنوان "درمعنی اینکہ بقائے نوع از امومت است و حفظ و احترام امومت اصل اسلام است

یعنی بقاء نسل کا انحصار عورتوں پر ہے۔ اس لیے ان کی حفاظت اور ان کا احترام اصل اسلام ہے۔

حافظ رمز اخوت مادراں
قوت قرآن و ملت مادراں

مائیں رمز اخوت کی محافظ اور مائیں قرآن و ملت کے لیے قوت ہیں۔

خاتم اقوام کے خصائص کا نچوڑ

جو خاتم اقوام کی حیثیت سے ملت اسلامیہ عالم میں حکمرانی کے فرائض انجام دینے اور امن و آشتی و انصاف و رفع شر کے لئے بنی اس کے خصائص حسب ذیل ہیں۔

(۱) وہ دنیا میں ہر طرح کی غلامی کا سدباب کر کے حریت قائم کرے گی اور مساوات انسانی اور بنی نوع آدم میں بھائی چارہ کے اصول پر عمل پیرا ہو گی۔ یہی اس کا مقصد ہو گا نہ کہ جوع الارض و قومی عصبیت جن کو وہ گناہ قرار دے گی۔

(۲) چونکہ اس کی بنیاد نوامیس الٰہیہ پر ہو گی اور اصول پر کام کرے گی۔ اس لئے وہ جغرافیائی حدود سے بالاتر ہو گی۔ قومیت اور وطنیت سے متاثر نہ ہو گی۔ توحید و رسالت اس کے دو بڑے رکن ہوں گے۔

(۳) وطن اس قوم یا ملت کی بنیاد نہیں بنے گی وطنیت کی بنیاد پر آج اکثر حکومتیں قائم ہیں صرف کمیونسٹ حکومتیں اس سے مبرا ہیں۔ ان کی بنیاد اصول پر ہے لیکن وہ اصول انکار خدا ہے۔ ملت اسلامیہ کی اساس توحید و رسالت ہو گی کیونکہ نوامیس الٰہیہ کے بغیر انسان اپنے مقصد کو پہنچ ہی نہیں سکتا۔

(۴) یہ ملت کسی خاص وقت کے لئے نہیں بلکہ قیامت تک کے لئے ہے

کیونکہ یہ خاتم اقوام ہے اور آخری پیغام ربانی پر مبنی ہے۔ آخری نبی آچکا اور آخری امت بن چکی۔

۵۔ اس ملت کا آئین قرآن ہوگا جو اللہ کا کلام اور انسان کی ہر طرح کی ہدایت کا صحیفہ ہے۔ کوئی آئین کوئی انسان اس کے لئے تیار نہیں کرے گا۔

۶۔ اس ملت کی سیرت میں پختگی آئین الٰہیہ کی اتباع ہی سے پیدا ہوگی۔

۷۔ اس ملت کی سیرت میں حسن اتباع سنت رسول پاک صلعم سے ہی پیدا ہوگا۔

۸۔ اس ملت کا مرکز بیت الحرام ہوگا۔

۹۔ یہ ملت خانقاہی نہ ہوگی۔ بلکہ قوائے نظام عالم کی تسخیر کرے گی اور چاند تاروں کو اپنے تصرف میں لائے گی۔

۱۰۔ ملت میں فرد کی طرح احساس خودی نمودار ہوگا اور خودی پاک اور مکمل یہ لے ہوگی کہ وہ روایات ملیہ کو اپنے اندر ضم کرے گی اور اسی دائرہ میں کام کرے گی۔

۱۱۔ چونکہ بقائے نسل کا انحصار ماؤں پر ہے۔ ملت اسلامیہ عورتوں کی حفاظت اور ان کے احترام کو لازمی قرار دے گی۔

عشق رسول

محمد عربی کابروئے ہر دو سرا است   کسے کہ خاک درش نیست خاک بر سر او

شاید ہی کوئی ممتاز شاعر ایسا ہو جس نے جامع صفات و کمالات انسان کامل محمد الرسول اللہ صلعم کی شان اقدس میں نعت گوئی کا حق ادا کیا ہو وہ سعدی علیہ الرحمۃ امیر خسرو خواجہ فرید الدین عطار و قدسی وغیرہ جیسے بزرگ ہوں یا عرفی و فیضی جیسے رند۔ عرفی کہتا ہے۔

عرفی مشتاب ایں رہ نعت است نہ صحرا است
آہستہ کہ رہ بر سر تیغ است قدم را
ہشیار کہ نتواں بیک آہنگ سرودن
نعت شہ کونین و مدیح کے و جم را
تقدیر بیک ناقہ نشانید دو محمل
سلمائے حدوث تو و لیلائے قدم را

فارسی شعراء میں ملا جامیؒ اس فن کے استاد اور اس میدان کے سب سے کامیاب شہسوار مانے گئے ہیں۔ اردو شعراء میں محسن کاکوروی اور ناصر حرم حمید صدیقی نے بڑا نام پیدا کیا۔ ہندو شعراء نے بھی اس عنوان پر گرم جوشی سے طبع آزمائی کی ہے۔ عرش ملسیانی اور   کی نعتیں اگر بلا نام پڑھی جائیں تو کوئی نہیں کہہ سکتا کہ ایک والہانہ عشق و محبت میں ڈوبے ہوئے مسلم گو کا کلام نہیں ہے۔ یہ تو ہے اس شرف انسانیت کی قدر افزائی جس نے عالم کو مسخر کرلیا اور مشک کی وہ خوشبو جو دنیا کے ہر گوشہ میں پھیل گئی جوش جیسا بے عقیدہ جو خدا کے وجود کے خلاف ماہر القادری سے بحثیں کرتا رہا آپ کی ذات گرامی کے متعلق لکھتا ہے "وہ انسان جس سے بہتر انسان پر یہ آفتاب کبھی طلوع نہیں ہوا۔"

نعت گوئی ایک فن بھی ہے اور ایک عقیدہ بھی۔ نعت گوئی فن کیوں بنی اور اس کے کیا اسباب تھے۔ اگر غور کیا جائے تو اس کی تہ میں ایک بڑا راز نظر آئے گا اور حقیقت نمایاں ہو جائے گی۔ کسی چیز کی قدر و منزلت بلاوجہ نہیں ہوتی۔ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی کی ایک ایک چیز اور آپ کا ایک ایک عمل محفوظ ہے جو آپ نے فرمایا اس کا ایک ایک لفظ اور

موجود ہے اور جس طرح بیان کے پرکھنے کے لئے کتاب ہے جس کا نام اسماء الرجال ہے جس میں ان تمام لوگوں کی زندگیوں کے حالات درج ہیں — جنہوں نے حدیثیں بیان کیں اور ان سے صحیح اور غلط معیار قائم کیا جاتا ہے۔ تاریخ کا یہ وہ کارنامہ ہے جس کی نظیر موجود نہیں ہے اور یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو اسوۂ حسنہ تمام عالم کے لئے بنایا تھا۔ اور اس لئے اس نے خود آپ کی زندگی کے ایک ایک واقعہ کو من وعن محفوظ کرنے کا اہتمام کیا ہے۔ اور قرآن پاک کی اس آیت کا بھی مادی ثبوت ہے کہ "رفعنا لک ذکرک" یعنی آپ کا ذکر بلند کر دیا گیا۔ آپ کے ذکر کے بلند کرنے کا صرف یہ کرشمہ نہیں ہے کہ آج ریگستان عرب کی وہ آواز اذان جو حبشی غلام بلال کی حلق سے نکلی تھی۔ چار دانگ عالم اور کرہ بھر میں آپ کی رسالت کے بانگ اعلان کے ساتھ گونج رہی ہے بلکہ آپ کے محاسن وصفات کو بیان کرنے سے کل حق پسند وحق آشنا اپنے کو عاجز پاتے ہیں۔ روضۂ اقدس کے بارے میں عرشی کہتے ہیں۔

ادب گاہیست زیر آسمان از عرش نازک تر
نفس گم کردہ می آید جنید و بایزید اینجا

ایک بزرگ فرماتے ہیں:-

نسبت خود بسگت کردم و بس منفعلم
زانکہ نسبت بہ سگ کوئے تو شد بے ادبی

زائر حرم نے ایک عجیب محویت کے عالم میں سلام لکھا ہے۔ جس کا لکھو سلام تو تقریباً سب لوگوں نے لکھا ہے لیکن زائر حرم کا انداز نرالا ہے ان کے عشق ومستی کا عالم ہی دوسرا ہے۔ دیکھئے کس کس کو حالت وجد میں سلام

کرتے ہیں۔ حتیٰ کہ آپ کی گلی کے کتوں کو بھی قابلِ احترام تصور کیا ہے۔

جو پہرا کرتے ہیں ستونوں کی طرح محبوب کا ۔۔۔ ان نگہبانانِ بلدِ شاہِ رسولاں کو سلام
جن کو حاصل ہے شرف آپ کی پابوسی کا ۔۔۔ اس گلی کوچے کے ذراتِ درخشاں کو سلام
نگہِ سرورِ کونین پڑی ہے جن پر ۔۔۔ جادہ و منزل و کہسار و بیاباں کو سلام
جن کے صدقے میں خلش ہوتی ہے اب تک دل میں ۔۔۔ سنگ ریزوں کو اور ان خارِ مغیلاں کو سلام
پاپیادہ جو چلے راہ میں دیوانۂ شوق ۔۔۔ اس غریب الوطن و بے سر و ساماں کو سلام
نعت پڑھتا ہوا مل جائے جو کوئی یمنی ۔۔۔ غائبانہ مرا اس مستِ غزل خواں کو سلام

اور شعر میں جس اندازِ بیان کی ندرت سے حضور سرورِ کائنات کو سلام لکھا ہے۔ اس کی مثال مجھے تو کہیں نہیں ملی۔

نازشؔ پیش کرو جب شہِ ذیشاں کو سلام ۔۔۔ ہم غریبوں کا بھی سلطانِ غریباں کو سلام
عرض کرنا کہ بایں ادب و شوق و نیاز ۔۔۔ قبلۂ اہلِ وفا کعبۂ ایماں کو سلام
یاد رکھنا حرمِ پاک کے جانے والو ۔۔۔ مجھ گنہگار کا اس رحمتِ یزداں کو سلام
بھول جانا نہ کہیں وقتِ تلاوت للہ ۔۔۔ مہبطِ وحیِ الٰہی حاملِ قرآں کو سلام
گوشہ گوشہ شبستانِ رسالت کے درود ۔۔۔ روضہ و منبر و محرابِ درخشاں کو سلام

اس کے ساتھ یہ بات بھی ہے کہ انسان کو اپنی کمتری اپنے سے برتر کے مقابلہ سے معلوم ہوتی ہے۔ حضور سرورِ کائنات صلعم کے مراتب کی بلندی کا تصور کرنے سے انسان اپنے کو ایسا ہیچ اور کمتر پاتا ہے کہ ذرۂ بے مقدار کا لفظ بھی موزوں نہیں آتا ہے۔ اس لئے کسرِ نفسی اور خاکساری سے نہیں بلکہ قطعی حقیقت شناسی کے طور پر اپنی حقارت پر افسوس اور آپ کی محبت و شیفتگی میں مست ہو جاتے ہیں۔ شیخ الحدیث مولانا مناظر احسن گیلانیؒ اس دور کے نہ صرف ایک عالم ربانی گزرے ہیں بلکہ ایک نئے اسلوبِ تحریر کے مالک اور انتہائی ذہین انسان تھے

موجود ہے اور ہر عمل ہر بیان کے پرکھنے کے لئے کتاب ہے جس کا نام اسماء الرجال ہے جس میں ان تمام لوگوں کی زندگیوں کے حالات درج ہیں۔ جنہوں نے حدیثیں بیان کیں اور ان سے صحیح اور غلط معیار قائم کیا جاتا ہے۔ تاریخ کا یہ وہ کارنامہ ہے جس کی نظیر موجود نہیں ہے اور یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو اسوۂ حسنہ تمام عالم کے لئے بنایا تھا۔ اور اس لئے اس نے خود آپ کی زندگی کے ایک ایک واقعہ کو من وعن محفوظ کرنے کا اہتمام کیا ہے۔ اور قرآن پاک کی اس آیت کا بھی مادی ثبوت ہے کہ "رفعنا لک ذکرک" یعنی آپ کا ذکر بلند کر دیا گیا۔ آپ کے ذکر کے بلند کرنے کا صرف یہ کرشمہ نہیں ہے کہ آج ریگستانِ عرب کی وہ آوازِ اذان جو حبشی غلام بلال کی حلق سے نکلی تھی۔ چار دانگ عالم اور بحر و بر میں آپ کی رسالت کے بانگ اعلان کے ساتھ گونج رہی ہے بلکہ آپ کے محاسن وصفات کو بیان کرنے سے کل حق پسند و حق آشنا اپنے کو عاجز پاتے ہیں۔ روضۂ اقدس کے بارے میں عرشی کہتے ہیں۔

ادب گاہیست زیر آسمان از عرش نازک تر
نفس گم کردہ می آید جنید و بایزید اینجا

ایک بزرگ فرماتے ہیں :-

نسبت خود بسگت کردم و بس منفعلم
زانکہ نسبت بسگ کوئے تو شد بے ادبی

زائر حرم نے ایک عجیب محویت کے عالم میں سلام لکھا ہے۔ یوں سرکار کو سلام تو تقریباً سب لوگوں نے لکھا ہے لیکن زائر حرم کا انداز تو کچھ ہے ان کے عشق و مستی کا عالم ہی دوسرا ہے۔ دیکھئے کس کس کو حالتِ وجد میں سلام

کرتے ہیں۔ حتیٰ کہ آپ کی گلی کے کتوں کو بھی قابلِ احترام تصور کیا ہے۔

جو پھرا کرتے ہیں مستوں کی طرح گلیوں میں
ان سگانِ بلدِ شاہِ رسولاں کو سلام
جن کو حاصل ہے شرف آپ کی پابوسی کا
اس گلی کوچے کے ذراتِ درخشاں کو سلام
نگہِ سرورِ کونین پڑی ہے جن پر
جادۂ منزل و کہسار و بیاباں کو سلام
جن کے صدقے میں خلش ہوتی ہے اک اک دل میں
سنگریزوں کو اوراقِ خارِ مغیلاں کو سلام
پاپیادہ جو چلے راہ میں دیوانۂ شوق
اس غریب الوطن و بے سر و ساماں کو سلام
نعت پڑھتا ہوا مل جائے جو کوئی یمنی
غائبانہ مرا اس مستِ غزل خواں کو سلام

اور شعر میں جس اندازِ بیان کی ندرت سے حضور سرورِ کائنات کو سلام لکھا ہے۔ اس کی مثال مجھے تو کہیں نہیں ملی۔

نامہ بھیجیں گے جب شہِ ذیشاں کو سلام
ہم غریبوں کا بھی سلطانِ غریباں کو سلام
عرض کرنا بکمالِ ادب و شوق و نیاز
قبلۂ اہلِ وفا کعبۂ ایماں کو سلام
یاد رکھنا حرمِ پاک کے جانے والو
مجھ گنہگار کا اس رحمتِ یزداں کو سلام
بھول جانا نہ کہیں وقتِ تلاوت للّٰہ
مہبطِ روحِ امیں حاملِ قرآں کو سلام
گوشہ گوشہ شبستانِ رسالت کے درود
روضہ و منبر و محرابِ درخشاں کو سلام

اس کے ساتھ یہ بات بھی ہے کہ انسان کو اپنی کمتری اپنے سے برتر کے مقابلے سے معلوم ہوتی ہے۔ حضور سرورِ کائنات صلعم کے مراتب کی بلندی کا تصور کرنے سے انسان اپنے کو ایسا ہیچ اور کم مایہ پاتا ہے کہ ذرۂ بے مقدار کا لفظ بھی موزوں نہیں آتا ہے۔ اس لئے کسرِ نفسی اور خاکساری سے نہیں بلکہ قطعی حقیقت شناسی کے طور پر اپنی حقارت پر افسوس اور آپ کی محبت و شیفتگی میں مست ہو جاتے ہیں۔ شیخ المحدث مولانا مناظر احسن گیلانیؒ اس دور کے نہ صرف ایک عالمِ ربانی گزرے ہیں بلکہ ایک نئے اسلوبِ تحریر کے مالک اور انتہائی ذہین انسان تھے

زہد و تقویٰ عبادت و ریاضت میں ممتاز تھے ذرا غور کیجئے کہ وہ آستانہ نبوت صلعم پر حاضر ہو کر کیا کہتے ہیں :-

ہر اک سے ٹکرا کر | مجبور ہو گھبرا کر | ہر فعل سے شرما کر | ہر کام سے پچھتا کر

آمد بدرت منگر

اے خاتم پیغمبر | یا قاسم الکوثر | اے سرورِ ہر سرور | اے رہبرِ ہر رہبر

اے آنکہ توئی افسر | ہر بہتر و ہر مہتر | فی المبدأ والمحشر | اے ہستیِ تو محمود

الاکبر الاصغر | اے طلعت تو منظر | الاول و الآخر | اے رحمت جہاں پرور

آقائے کرم گستر | آمد بدرت منگر

از رفتہ چہ پرسانے | نے علم نہ عرفانے | نے دین نہ ایمانے | نے فضل نہ احسانے

از خانۂ ویرانے | ور قلب احزانے | واجبس نہ ندانے | تا شکر کہ گو زانے

آمد بدرت منگر | کا انا نر و اعظط

شاہا تو بمن منگر | بر رحمت خود منگر | انصاف تو کن آخر | غیر از تو مرا دیگر

من نازل و الناصر | والشافع مستغفر

اقبال کے لئے عشق رسول ؐ ایک عقیدہ ہے محکم اور پختہ عقیدہ اور وہ لفظوں میں ہی اس کا پیام ہے ۔ وہ سرمستی و سرجوشی کے عالم میں سرور کائنات صلعم کا ذکر کرتا ہے ۔ اس ذکر میں منطقی دلائل بھی ہیں فلسفہ بھی ہے اور عشق و محبت کی بیتابیاں بھی ۔ اس کی سرمستی کی وجہ یہ ہے کہ وہ آپ کی ذات بابرکات میں کمالات و صفات کو اللہ تعالیٰ کی جانب سے کل بنی نوع انسان کے لئے ہدایت رشد کا پیام لانے والا اور انسانیت کو وہ منشور دینے والا مانتا ہے جو دونوں عالم میں اس کی نجات کا وسیلہ اور حیات کے ہر شعبہ پر حاوی ہے ۔ اس لئے کہیں بھی اس نے فن شعر کی رعایت سے غلو نہیں کیا ۔ اور اس لئے کہیں کہیں اس کی

نعتیں منظوم بخشیں اور یہ یکی نظر آتی ہیں۔ لیکن اس کی تلافی وہ دوسری جگہوں پر اپنی اور تمثیلات اور تحقیق انکار سے کرتا ہے مثلاً نعرہ "ابوجہل در حرم کعبہ" یہ بھی دراصل ایک نعت ہے۔ حالانکہ اس کو اس طرح ظاہر کیا ہے کہ ابوجہل کعبہ میں اپنے بتوں سے فریاد کر رہا ہے اور ایک طرح سے شکایات کر رہا ہے حالانکہ دراصل انہیں شکایات میں مدح پنہاں ہے۔ مثلاً ابوجہل آپ کے بارے میں یہ شکایت کرتا ہے کہ "با غلام خویش بر یک خوان نشست"

یعنی اپنے غلام کے ساتھ ایک دسترخوان پر بیٹھ کر کھانا کھاتا ہے۔ نبی پاک صلعم نے اپنی بعثت کے بعد پرانے رسم و رواج اور انکار و قوانین کو ملیامیٹ کر کے ایک جدید سوسائٹی نئے آئین کے ساتھ تعمیر کیا یہ ایک شعلہ تھا جس نے خس و خاشاک باطل کو پھونک کر رکھ دیا۔ اس کے بیان کرنے کا ایک انداز براہ راست ہے اور دوسرا تمثیلی مثلاً ابوجہل کی زبان سے براہ راست انداز کبھی پھیکا بھی ہو سکتا ہے۔ کیونکہ اس میں اس فلسفے کا دخل ہوتا ہے اور فلسفہ کی زبان خشک ہوتی ہے لیکن براہ راست بیان کے انداز کا بانکپن بھی حسب ذیل اشعار میں ملاحظہ کیجیے۔ حضرت فاطمہؓ کی مدح کے سلسلے میں کہا ہے کہ

مریم از یک نسبت عیسیٰ عزیز ۔۔۔ از سہ نسبت حضرت زہرا عزیز

یعنی حضرت مریم کے اعزاز و اکرام کے لئے تو ایک ہی نسبت ہے یعنی یہ کہ وہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی ماں تھیں لیکن حضرت فاطمہؓ کو اعزاز و اکرام کی تین جہتیں حاصل ہیں۔

نور چشم رحمۃ للعالمین ۔۔۔ آں امام اولین و آخرین
آنکہ جاں در پیکر گیتی دمید ۔۔۔ روزگار تازہ آئین آفرید

یعنی ذات رحمۃ للعالمین صلی اللہ علیہ وسلم کی آنکھوں کی نور یعنی جو

اور وہ کون تھے۔ رحمۃ اللعالمین وہ امام اولین و آخرین تھے اور وہ، وہ تھے جنھوں نے جو مردہ ہو چکا تھا جان ڈالی اور نئے آئین تازہ کے ساتھ ایک زمانے کو پیدا کیا۔

دو اور نسبتیں یہ بیان کی ہیں کہ مرتضیٰ مشکل کشا شیرِ خدا کی بی بی اور کاروانِ سالارِ عشق حضرت امام حسینؓ کی ماں، جہاں لہجہ خشک اور پھیکا اور منطقی و نظریاتی ہے اس کی مثال ذیل میں ملاحظہ ہو۔

در دلِ مسلم مقامِ مصطفےٰ است ۔۔۔ آبروئے ما ز نامِ مصطفےٰ است
بوریا ممنونِ خوابِ راحتش ۔۔۔ تاجِ کسریٰ زیرِ پائے امتش
در شبستانِ حرا خلوت گزید ۔۔۔ قوم و آئین و حکومت آفرید
ماند شبہا چشمِ او محرومِ نوم ۔۔۔ تا بہ تختِ خسروی خوابید قوم
در جہاں آئینِ نو آغاز کرد ۔۔۔ مسندِ اقوامِ پیشیں در نورد
از کلیدِ دیں درِ دنیا کشاد ۔۔۔ ہمچو او بطنِ امِ گیتی نزاد

یعنی مسلمان کے دل میں حضرت مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم کا مقام ہے اور ہماری آبرو آپ ہی کے نام سے ہے۔ آپ ٹاٹ پر سوتے تھے اور امت کے پیر کے نیچے کسریٰ کا تاج تھا۔ حرا کے غار میں خلوت اختیار کی اور قوم آئین و حکومت پیدا کی۔ کتنی راتیں آپ نے بلا سوئے گزار دیں اور نتیجہ میں قوم تختِ خسروی پر جا کر سوئی۔ دنیا میں آئینِ نو کا آغاز کیا اور پرانی قوموں کی مسندیں الٹ دیں۔ دین کی کنجی سے دنیا کا دروازہ کھولا۔

اب والہانہ اندازِ بیان کا ایک قطعہ سنئے۔

عجب کیا گر مہ و پرویں مرے نخچیر ہو جائیں
کہ بر فتراکِ صاحب دولتے بستم سرِ خود را
وہ دانائے سبل ختم الرسل مولائے کل جس نے
غبارِ راہ کو بخشا فروغِ وادیٔ سینا
نگاہِ عشق و مستی میں وہی اول وہی آخر
وہی قرآں وہی فرقاں وہی یٰسیں وہی طٰہٰ

حضرت بلال اور سکندر رومی کا مقابلہ کرکے کیسا خوب انگریز عشق رسول کا پیام دیا ہے۔

جولانگہ سکندر رومی تھا ایشیا — گردوں سے بھی بلند تر اس کا مقام تھا
تاریخ کہہ رہی ہے کہ رومی کے سامنے — دعویٰ کیا جو پورس و دارا نے خام تھا
آج ایشیا میں اس کو کوئی جانتا نہیں — تاریخ داں بھی اسے پہچانتا نہیں
لیکن بلال وہ حبشی زادۂ حقیر — فطرت تھی جس کی نورِ نبوت سے مستنیر
جس کا امیں ازل سے ہوا سینۂ بلال — محکوم اس صدا کے ہیں شاہنشہ و فقیر
اقبال کس کے عشق کا یہ فیضِ عام ہے
رومی فنا ہوا حبشی کو دوام ہے

اقبال عشق رسول کا مبلغ بھی ہے اور شاعر کا ادعا اس کے کلام کی بہترین تاویل ہوتی ہے۔ کہتا ہے ؎

کشتۂ اندازِ ملا جامیم — نظم و نثرِ او علاجِ خامیم

اور میں ملا جامی کے انداز کا کشتہ ہوں اور ملا جامی کی نظم و نثر میری خامی کا علاج ہے۔ اس میدان میں اپنی کمتری اور دوسروں کی برتری کا اعتراف اقبال ہی تک محدود نہیں ہے یہ معجزہ پیدا کرنا سب کے شعور کے باہر ہے۔

ملا جامی فرماتے ہیں ؎

حریفاں بادہا خوردند و رفتند　　تہی خمخانہ ہا کردند و رفتند

مجھ سے پہلے جو گذرے انھوں نے شراب پی اور ایسی پی کر خم خانہ کو خالی کر دیا اور چلدئے میرے لئے دھرا ہی کیا ہے -

حضرت بلالؓ کے عشق کا تذکرہ بڑے ہی جذب و کیف کے ساتھ کر گئے اور آخر میں اپنے اصل موضوع کو یوں آشکارہ کیا ہے -

ادا تھے دیدہ سراپا نیاز تھی تیری　　کسی کو دیکھتے رہنا نماز تھی تیری
اذاں ازل سے تیرے عشق کا ترانہ بنی　　نماز اس کے نظارہ کا اک بہانہ بنی

خوشا وہ وقت کہ یثرب مقام تھا اس کا
خوشا وہ دور کہ دیدار عام تھا اس کا

عشق رسول صلعم خود سپردگی اور جرأت رندانہ کی وہ راہ ہے جہاں جان کا خوف کوئی حقیقت نہیں رکھتا - ایک حاجی مدینہ منورہ جا رہا ہے - دیار حبیب کا راستہ خطرات سے لبریز ہے - آج کی طرح راہیں محفوظ نہیں ہیں - قافلے کو ڈاکو لوٹ لیتے ہیں - چنانچہ قافلہ کا ایک حاجی سوچ رہا ہے کہ اب وہ کیا کرے -

قافلہ لوٹا گیا صحرا میں اور منزل ہے دور　　اس بیاباں یعنی بحر خشک کا ساحل ہے دور
ہمسفر میرے شکار دشنۂ رہزن ہوئے　　بچ گئے جو ہو کے بے دل سوئے بیت اللہ پھر
اس بخاری نوجواں نے کس خوشی سے جان دی　　موت کے زہراب میں پائی تھی اس نے زندگی
خنجر رہزن اسے گویا ہلال عید تھا　　"ہائے یثرب" دل میں، لب پر نعرۂ توحید تھا

حالت یہ ہے کہ لوگ قتل کر دئے گئے ہیں - انہی میں ایک بخاری نوجوان تھا - اس نے راہ دیار محبوب میں موت کو زندگی سمجھ کر ایسی خوشی سے جان

دی گر گویا عید کا چاند دیکھا ہے ۔ اس کے دل میں "ہائے یثرب" یعنی یہ حسرت تھی کہ یثرب نہیں پہنچا" اور لب پہ کلمۂ توحید تھا یہ مثال اس حاجی کے سامنے ہے اور موت کے گھناؤنے منظر ہیں ۔ آگے بھی خطرہ ہے جان کا ڈر ہے جو ساتھی پہنچ گئے تھے وہ بد دل ہو کر مکہ شریف واپس ہو گئے ہیں اور حاضری دربار رسالت کا خیال مجبوراً ترک کر دیا ہے ۔ اب اس حاجی کے دل میں کشمکش پیدا ہوتی ہے

خوف کہتا ہے کہ یثرب کی طرف تنہا نہ چل
شوق کہتا ہے کہ تو مسلم ہے بیباکانہ چل

اس خوف و شوق کی کشمکش کا انجام یہ تھا کہ عشق کی ایک بجلی کوندتی ہے اور وہ فوراً اپنا فیصلہ صادر کرتا ہے ۔

بے زیارت سوئے بیت اللہ پھر جاؤں گا کیا
عاشقوں کو روزِ محشر منہ نہ دکھلاؤں گا کیا
خوفِ جاں رکھتا نہیں کچھ دشتِ پہنائے حجاز
ہجرتِ مدفونِ یثرب میں یہی مخفی ہے راز
گو سلامت محملِ شامی کی ہمراہی میں ہے
عشق کی لذت مگر خطروں کی جانکاہی میں ہے

اقبال اس درجہ عشقِ رسول میں ڈوبا ہوا ہے کہ اپنی موت بھی حجاز ہی میں چاہتا ہے ۔ اور اگر وہاں بیمار پڑے تو دوا علاج کا قائل نہیں بلکہ وہاں کی موت کو زندگی پر ترجیح دے گا ۔ چنانچہ عرصہ گذرا کہ عرب میں شفاخانے نہ تھے ۔ آج تو قدم قدم پہ اسپتال ہیں ۔ خود حکومت سعودی عرب کا انتظام اس معاملے میں نہایت معقول اور فیاضانہ ہے اور دورانِ ایامِ حج دیگر ممالک کے بھی اسپتال تقریباً ہر محلہ میں قائم ہو جاتے ہیں ۔ جہاں مریضوں کو

سے مریضوں کا مفت علاج ہوتا ہے، مفت دوا ملتی ہے۔ اور اگر کوئی شخص حرکت کے قابل نہ ہو تو اس کے جائے قیام پہ ڈاکٹر بلا فیس آکر اسے دیکھتے ہیں۔ عورتوں کے لئے لیڈی ڈاکٹر اور نرسیں بھی ہیں لیکن یہ بات اس زمانے کی ہے جب وہاں کوئی شفاخانہ نہ تھا۔ یہ تو ایک تحریک چلی کہ جدہ میں ایک شفاخانہ کھولا جائے اور اس سلسلہ میں چندہ کیا جائے اس سلسلے میں اقبال کے تاثرات کیا تھے۔

اک پیشوائے قوم نے اقبال سے کہا — کھلنے کو جدہ میں ہے شفاخانۂ حجاز
ہوتا ہے تیری خاک کا ہر ذرہ مضطرب — سنتا ہے تو کسی سے جو افسانۂ حجاز
دستِ جنوں کو اپنے بڑھا جیب کی طرف — مشہور تو جہاں میں ہے دیوانۂ حجاز

دارالشفا حوالیِ بطحا میں چاہیے
نبضِ مریض پنجۂ عیسیٰ میں چاہیے

میں نے کہا کہ موت کے پردے میں ہے حیات — پوشیدہ جس طرح ہو حقیقت مجاز میں
تلخابۂ اجل میں جو عاشق کو مل گیا — پایا نہ خضر نے مئے عمرِ دراز میں
اوروں کو دیں حضور یہ پیغامِ زندگی — میں موت ڈھونڈتا ہوں زمینِ حجاز میں

اسی خیال کو زیادہ سرگرمی اور خونِ تمنا سے "رموزِ بیخودی" کے آخر میں "عرضِ حالِ مصنف بحضور رحمۃ للعالمین" کے عنوان سے لکھا ہے۔ پہلے بڑے والہانہ انداز میں نعت بیان کی ہے

اے ظہورِ تو شبابِ زندگی — جلوہ ات تعبیرِ خوابِ زندگی
اے زمیں از بارگاہت ارجمند — آسمان از بوسۂ بامت بلند
شش جہت روشن ز تابِ روئے تو — ترک و تاجیک و عرب ہندوئے تو
از تو بالا پایۂ این کائنات — فقرِ تو سرمایۂ این کائنات

در جہاں شمعِ حیات افروختی — بندگاں را خواجگی آموختی

اس مدح اور ثنا کے بعد کہتے ہیں کہ جب سے آپ پر میری نظر پڑی ہے تو آپ مجھے اپنے ماں باپ سے بھی زیادہ محبوب ہو گئے ہیں۔ عشق نے میرے اندر ایک آگ لگا دی ہے۔ اور میری جان کو سوختہ کر دیا ہے۔

تا مرا افتاد بر رویت نظر — از اب و ام گشتۂ محبوب‌تر
عشق در من آتشے افروخت است — فرصتش بادا کہ جانم سوخت است

اس کے بعد مسلمانوں کا حالِ زار بیان کرتے ہیں کہ وہ آپ کی تعلیم سے الگ ہو گئے ہیں اور ہر ایک کی بغل میں کوئی نہ کوئی بت ہے۔

از منات و لات و عزیٰ و ہبل — ہر یکے دارد بتے اندر بغل

یہ مردہ لاش ہو گئے تھے اور طبیب عاجز تھے۔ میں اس لاش کو اٹھا کر حضور مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم میں لایا ہوں۔ میں نے اپنے کلام سے جو سرِ قرآن سے لبریز ہے اور آبِ حیواں سے زندہ کر رہا ہوں۔

نعشش از پیشِ طبیباں بردہ‌ام — در حضورِ مصطفیٰ آوردہ‌ام
مردہ بود از آبِ حیواں گفتمش — سرّے از اسرارِ قرآں گفتمش

پھر کہتا ہے کہ اے فیاضِ ہستی جس نے بوصیری شاعر کو ایک قصیدہ کے صلہ میں اپنی چادر عطا فرما دی تھی۔ میری بھی ایک تمنا سرکار سے ہے۔ میں ایک خطا اندیش ہوں۔ مجھے ذوقِ حق عطا کر کیونکہ میں اپنی پونجی نہیں پہچانتا ہوں۔

اے بوصیری را ردا بخشندۂ — بربطِ سلمیٰ مرا بخشندۂ
ذوقِ حق دہ ایں خطا اندیش را — اینکہ نشناسد متاعِ خویش را

پھر نعت کے چند اشعار بڑے ہی بلند پایہ لکھنے کے بعد کہتے ہیں کہ

اگر میں نے تیرے احکام نہیں پہنچائے ہیں تو میری پرسش کر، وہ سزا کیا ہے۔ وہ یہ ہے کہ روزِ محشر میں مجھ کو خوار و رسوا کر اور اپنے پیر کے بوسہ سے محروم کر دے۔ یہ ہے عشق و محبت کی وہ آخری منزل جہاں اقبال تھا۔

روزِ محشر خوار و رسوا کن مرا
بے نصیب از بوسۂ پا کن مرا

اس کے بعد کہتے ہیں کہ اگر میں نے رموزِ قرآن بیان کئے ہیں تو میری ایک آرزو ہے جو پوری کی جائے۔ وہ وہی تمنا ہے جس کے لئے یہ طویل نظم لکھی گئی ہے وہ تمنا اقبال کے نزدیک ایسی ہے جس کے وہ حقدار نہیں اس نے پہلے اپنی خامیوں اور اپنے گناہوں کا تذکرہ کیا ہے جن میں یہ بھی لکھا ہے کہ عرصہ تک وہ شک و شبہ کے صحرا میں بھٹکتے رہے

سالہا بودم گرفتارِ شکے
از دماغِ خشکِ من لا ینفکے

حرفے از علم الیقیں ناخواندۂ
در گمان آبادِ حکمت ماندۂ

اور پھر کہتے ہیں کہ ان تمام باتوں کی وجہ سے اس تمنا کے اظہار میں مجھ کو شرم آتی ہے۔

شرم از اظہار او آید مرا
شفقتِ تو جرأت افزاید مرا

لیکن آپ کی رحمت عام ہے اس لئے میری ہمت ہوتی ہے کہ اس تمنا کا اظہار کروں۔ اتنی تمہید کے بعد جس تمنا کا اظہار کیا جا رہا ہے وہ کس طرح صمیم قلب سے نکلی ہوگی اور اس سے اس عشق و محبت کا اندازہ کیا جا سکتا ہے جو اقبال کی رگ رگ میں سمائی ہوئی تھی۔

وہ شہر کیسا اچھا ہے جس میں آپ آرام فرما رہے ہیں۔ وہ خاک کتنی ٹھنڈی ہے جہاں آپ آسودہ خواب ہیں وہ میرے محبوب کا شہر اور مسکن ہے اور عاشق کے لئے یہی حب الوطن ہے۔ میرے ستارے کو دیدۂ بیدار

بخش کر اپنے دیوار کے سایہ میں ایک مرقد مجھے عطا ہو۔

اے خنک خاکے کہ آسودی دراں
مسکن یار است و شہر شاہ من
مرقدے در سایۂ دیوار بخش

فرخا شہرے کہ تو بودی دراں
پیش عاشق ایں بود حب الوطن
کوکبم را دیدۂ بیدار بخش

تاکہ میرے دل بیتاب کو سکون حاصل ہو اور میری بے چینی دور ہو اور فخر کے ساتھ میں آسمان سے یہ کہوں کہ دیکھو میرے آرام کو سیرا آغاز دیکھا تھا۔ وہ کیسا خراب تھا اور اب انجام دیکھو وہ کیسا حسین ہے۔

اس طرح اقبال عشق رسول کا پیغام دیتا ہے اور ہر دل میں اسے جاگزیں کرنا چاہتا ہے۔ دنیائے اسلام کے مشہور مفکر و خطیب مولانا سید ابوالحسن علی ندوی اپنی کتاب "کاروان مدینہ" میں تحریر فرماتے ہیں۔

"اقبال کے نعتیہ اشعار اور ان کے عشق رسول ؐ نے نہ صرف ایران و افغانستان اور برّاعظم ہندوستان بلکہ پورے عالم اسلام کو حرارت عشق اور کیفیت مستی سے بھر دیا ہے اور جنھوں نے نعت میں بھی اپنی نئی نئی روشنی نکالی ہے اور اس کے اندر بھی احیاء اور انقلاب کا سامان پیدا کر دیا۔"

اقبال کا تصور سفر مدینہ

اقبال اگرچہ کبھی یثرب و بطحیٰ کا سفر نہ کر سکے لیکن اس سفر مبارک کا ایک نہایت دلکش تصور جا بجا ان کے کلام میں ملتا ہے۔ جو ان کے "عشق رسولؐ کے جذبۂ خالص کا ایک بہت ہی بڑا اور خوبصورت ثبوت ہے۔ پیام "مشرق" میں ایک حدی انھوں نے لکھی ہے خیال کی دنیا میں وہ مدینہ منورہ کی جانب جا رہے ہیں اور اونٹ کی سواری ہے شتربان

اونٹنی کے لئے گاتا رہا ہے۔ وہ اس کی تعریف میں اسے کبھی "کوہِ ہم وہ بنا رسن" اور کبھی "آہوئے تاتار سن" کہتا ہے اور کبھی "ناقۂ سیار سن" اور اسی طرح کے بہت سے تعریفی الفاظ کے بعد بار بار دہرایا ہے کہ :

تیز ترک گام زن منزلِ ما دور نیست

یعنی ذرا اور تیز قدم بڑھا۔ ہماری منزل دور نہیں ہے۔ یہ اس آتشِ شوق کا تقاضا ہے جو سینہ کے اندر سلگ رہی ہے کہ کب جلد سے جلد دیارِ حبیب میں پہنچ جائیں۔ یہ شاہکار نظم تمام ہندوستان میں بالعموم اور عربی مدارس میں بالخصوص بڑے وجد کے ساتھ پڑھی گئی ہے اور بار بار پڑھ کر دلدادگانِ منزلِ شوق نے اس سے لطف اٹھایا ہے۔ بے خودی اور بے تابی کے حسنِ کلام کو دیکھنے کے لئے ایک بند ملاحظہ ہو۔ بیتاب عاشق کہتا ہے کہ چاند چھپ گیا، مشرق سے صبح نمودار ہو گئی۔ رات نے اپنا جامہ چاک کر دیا، بیاباں کی ہوا چلنے لگی۔ ذرا تیز قدم اٹھا منزل دور نہیں ہے۔

مہ ز سفر پا کشید

در پسِ تل آرمید

صبح ز مشرق دمید

جامۂ شب بر درید

باد بیاباں وزید

تیز ترک گام زن منزلِ ما دور نیست

اسی طرح خستہ پا عاشق جانباز رہروِ منزلِ حجاز کہتا ہے کہ اے ساربان تیری سست رفتاری سے تم چل رہے ہو، میرے ساتھی تو سب یثرب پہنچ گئے۔ اور ہم ابھی نجد ہی میں ہیں۔ ذرا ایسا ہو کہ! حدی، گاؤ

کہ اونٹنی وجد میں آجائے۔ پانی برس گیا ہے۔ اور زمین پر سبزہ اُگ آیا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ اسی لئے اونٹنی کے پیر سست ہو رہے ہیں۔ وہ غالباً سبزے کی تلاش میں رہتی ہے۔ اس لئے ایسے راستے سے چلو جہاں سبزہ کم ہو تاکہ تیز رفتاری سے ہم آگے بڑھ سکیں۔ میری جان دردِ جدائی سے بیتاب ہو رہی ہے۔ اس لئے جلدی کرو۔ ایک عجیب و غریب کیف و مستی میں ڈھلی ہوئی نظم ہے۔

ابر باراں در زمیں با سبزہ است — می شود شاید کہ پائے ناقہ سست

جانم از دردِ جدائی در نفیر — آں رہے کو سبزہ کم دارد بگیر

ساربان یاراں بہ یثرب ما بہ نجد

آں حدی کو ناقہ را آرد بہ وجد

الغرض اقبال کا پورا کلام "عشقِ رسول" کے جذبے سے معمور ہے اور اگرچہ یہ بات کہی جا چکی ہے مگر پھر کہہ دینا اس کتاب کے مقصد کے لحاظ سے ضروری ہے کہ اس کا "عشق" محض روایتی نہیں ہے بلکہ حیات و کائنات اور فلسفہ مشرق و مغرب کے مطالعہ کے بعد اس نے ایک مستحکم عقیدہ بنایا ہے اور وہ یہ کہ انسان کی صلاح و فلاح اور دنیا میں امن و اماں کے قیام اور فرد اور قوم کی نجات دینی و دنیوی کے لئے لازم ہے کہ وہ اپنے آپ کو اوامرِ الٰہیہ کا متبع و منقاد بنا دے۔ کیونکہ عقلِ انسانی اس معاملہ میں اس کی رہنمائی سے قاصر ہے۔ اس سے جہاں وجودِ واجب الوجود اور توحیدِ الٰہی کا لازم آیا رسالت کا بھی عقیدہ ضروری قرار پایا۔ اللہ تعالیٰ اپنے احکام ایک پیغمبر یا نبی اور رسول برحق ہی کے ذریعہ انسانوں تک پہنچا سکتا ہے۔ اور پیغمبر عربی صلعم اس

دنیا کے آخری نبی تھے اور آپ کا پیغام آخری پیغام تھا۔ اور آپ نے جس ملت کی تعمیر کی وہ صرف خیر الامم ہی نہیں خاتم اقوام تھی جس طرح آپ خاتم النبیین تھے جیسے کہ آپ کے بعد کوئی نبی نہ ہوگا - آپ کے بعد کوئی پیغام بھی نہ آئے گا اور نہ کوئی نئی امت اٹھے گی۔ خیر کا دربار سجانے اور انسان کو نجات کا راستہ دکھانے کے لئے یہی ایک طریقہ ہے اور چونکہ یہ ضروری تھا کہ جو آخری پیغمبر قیامت تک کے لیے ہو وہ خود ان نوامیس الٰہیہ پر اخلاق کی ان اعلیٰ قدروں کے ساتھ عمل کرے کہ اس کی زندگی ہمیشہ کے لئے ایک نیک نمونہ بن جائے۔ اس لئے پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم جامع کمالات و صفات تھے۔ انسان بڑے کامل تھے اور انسانیت کے وہ کل شرف جو ایک انسان کو مل سکتے ہیں، آپ کی ذات میں جمع کر دئے گئے - ایک ایسی ذات بلاشبہ مستحق ہے کہ اس سے والہانہ محبت کی جائے اور اس کی سنت کو مقدم قرار دیا جائے۔ اور اسی عشق محمدی صلعم میں کل نیکیاں کل نوامیس الٰہیہ کا تقبل کل خیر سے وابستگی اور کل شر سے اجتناب آگیا - زندگی کا کوئی شعبہ اور حیات کا کوئی گوشہ باقی نہیں رہا۔ یہ عشق کسی غرض کے لئے نہیں ہے بلکہ صرف تحسین کے جذبہ سے پیدا ہوتی ہے - صرف پختہ عقاید کی پیداوار ہے حیات و کائنات کے راز کا نچوڑ ہے - اور اسی لئے "عشق رسول" پیام اقبال کا نچوڑ ہے - اور پیام اقبال کیا ہے - خلاصۂ اسلام ہے ؎

بجبریل امیں ہم داستانم
رقیب و قاصد و دربان ندانم

اقبال کا مردِ کامل

قبل مسیح کے مشہور تارک الدنیا فلسفی اور مجذوب قلندر ڈائی جنیز کی زندگی کا ایک مشہور واقعہ ہے کہ ایک دن روزِ روشن میں وہ چراغ لے کر چلا جا رہا تھا کسی نے اس خبطی سے ازراہِ تمسخر سوال کیا کہ کیا ڈھونڈھ رہے ہو، تو جواب دیا کہ ایک انسان کی تلاش ہے۔ مرشد رومی نے معلوم نہیں کس حالتِ کیف و جذب میں ایک غزل کہی تھی جسے اقبال نے اپنے کلام میں بڑی ہی بڑی اہمیت دی ہے۔ اس کے تین حسبِ ذیل اشعار اسرارِ خودی کا سرنامہ قرار دیے گئے ہیں۔

دی شیخ با چراغ ہمی گشت گردِ شہر
کز دام و دد ملولم و انسانم آرزوست
زیں ہمرہانِ سست عناصر دلم گرفت
شیرِ ژیاں و رستمِ دستانم آرزوست
گفتم کہ یافت می نشود جستہ ایم ما
گفت آنکہ یافت می نشود آنم آرزوست

یعنی کل شب میں شیخ چراغ لے کر شہر میں گھوم رہا تھا کہ میں ان شیطانوں سے عاجز ہوں اور ایک انسان کی آرزو ہے۔ میرے ان سب عناصر ساتھیوں نے میرا خون کر دیا۔ مجھے شیر ژیاں اللہ تم دستاں کی تلاش ہے۔ میں نے کہا کہ ہم لوگوں نے بہت تلاش کیا مگر دستیاب نہیں ہوتا جواب دیا کہ جو ڈھونڈھے سے نہیں ملتا اسی کی آرزو ہے۔

جاوید نامہ میں اقبال نے آرزو اور جستجو سے بے تاب ہو کر رومی کی یہ پوری غزل لب دریائے ناپیدا کنار ہنگام غروب آفتاب مستانہ انداز میں پڑھی۔ نتیجہ یہ ہوا روح رومی تمام پردوں کو چاک کر کے نمودار ہوئی اسرار امواج کی شرح کی۔ اور حکمت افلاک پر قدرت دلائی۔

اقبال خدا سے دعا کرتا ہے کہ۔

یا دگر آدم کہ از ابلیس باشد کمترک
یا دگر ابلیس بہر امتحانِ عقل و دیں
یا چناں کن یا چنیں

گویا کہ عہد حاضر کا انسان شیطان سے کسی طرح کم نہیں ہے۔ اس لئے خدایا تو دوسرا انسان بنا جو ابلیس سے کم ہو یا دوسرا ابلیس امتحانِ عقل و دیں کے لئے پیدا کر۔ یا اس طرح کر یا اس طرح۔

جاوید نامہ میں ابلیس اس طرح فریاد کرتا ہے ؎

اے خداوند صواب و ناصواب — من شدم از صحبتِ آدم خراب
ہیچ گر از حکم من سر برنتافت — چشم از خود بست و خود را در نیافت
صید خود صیاد را گوید بگیر — الاماں از بندۂ طاعت پذیر

اے نیکی و بدی کے خدا میں انسان کی صحبت سے خراب ہو گیا۔ کبھی

بھی وہ میرے حکم سے گردن نہیں موڑتا اپنی معرفت سے آنکھ بند کر کے اپنے
آپ کو گم کر چکا ہے۔ شکار خود شکاری سے کہتا ہے کہ مجھے پکڑ۔ اس بندۂ
طاعت پذیر سے میں پناہ مانگتا ہوں۔ چنانچہ اس کی التجا یہ ہے۔

اے خدا ایک زندہ مردِ حق پرست — لذتے شاید کہ یابم در شکست

اے خدا ایک زندہ مرد حق پرست بھیج دے تاکہ شاید میں اس سے
شکست کی لذت پا سکوں۔

اقبال کی ان تمام شاعرانہ معاملات کا منشا یہ ہے کہ موجودہ وقت کا
انسان شرفِ انسانیت سے بہرہ مند نہیں ہے اور اس لئے وہ ایک ایسے
انسانی مخلوق کی تلاش میں ہے۔ جو انسانیت کی تمام خوبیوں سے بھرپور
ہو اور یہی اقبال کا مردِ کامل ہے۔

انسانیت کی عظمت

بظاہر آسمان بلند اور انوار تصور کیا جاتا ہے اور خاکِ اسفل زمین
حقیر سمجھی جاتی ہے۔ مگر اقبال کے نزدیک زمین آسمان سے بہتر ہے۔
کیونکہ اسے "انسانیت" کی امانت سپرد ہوئی۔ روزِ آفرینش آسمان
نے زمین کو طعنہ دیا کہ تیری طرح کسی کو ہیچ بہ بخت نہیں پایا۔ تمام کائنات
میں تیری طرح اندھا کون ہے۔ اور اگر میری قندیل تجھے روشن نہ کرے
تو تیرے اندر کوئی نور نہیں۔ خاک اگر الوند بھی ہو جائے پھر بھی خاک ہے
اور آسمان کی طرح روشن و پایندہ نہیں ہو سکتی۔

طعنہ زد چرخِ نیلی بر زمین — روزگار کس ندیدم این چنین
چوں تو اندر پہنائے من کورے کجا — جز بہ قندیلم ترا نورے کجا

خاک اگر الوند شد جز خاک نیست — روشن و پائندہ چوں افلاک نیست

زمین اس طعنہ سے نہایت شرمندہ ہوئی اور نا امید اور خستہ حال اور مضمحل ہو کر اس نے اپنی بے نوری کے متعلق پیشِ حق فریاد کی تب وہاں سے یہ ندا آئی کہ تو اس سے بہتر ہے کہ تجھے انسان کی امانت دی گئی ہے۔ جس کی عقل نے دنیا کو مسخر کیا اور جس کے عشق نے لامکاں کی تسخیر کی۔

اے امینِ از امانت بے خبر — غم مخور اندر ضمیرِ خود نگر
شستہ از لوحِ جاں نقشِ امید — نورِ جاں از خاکِ تو آید پدید
عقلِ آدم بر جہاں شب خوں زند — عشقِ او بر لامکاں شب خوں زند

(جاوید نامہ)

میلادِ آدم کے وقت عشق نے فریاد کی کہ خونیں جگرے پیدا ہوا اور حسن پر لرزہ طاری ہو گیا کہ صاحب نظر آ گیا۔ نعرہ زد کہ خونیں جگرے پیدا شد حسن لرزید کہ صاحب نظرے پیدا شد۔

جب انسان اپنی تمام خصائص انسانیت سے آراستہ ہو کر آشکارا ہوتا ہے تو نور سے بنے ہوئے فرشتے اس خاکی کے حسن کو دیکھ کر مست ہو جاتے ہیں۔ ع

کہ نوریاں بہ تماشائے خاکیاں مستند

انسان، مومن اکبر جبریل امین سے بھی افضل ہے۔ اقبال کہتا ہے کہ اگر انسانیت کا وہ تصور جو وہ پیش کرتا ہے۔ اس پر جبریل کی نگاہ پڑ جائے تو وہ اپنا نور پھینک کر بارگاہِ الٰہی میں سوز و سازِ آدم کی التجا پیش کرے

اگر ایں نامہ را جبریل خواند — چوں گرد آں نورِ تاب از خود فشاند

بگذار از مقام و منزل خویش — بہ یزداں گو جدا از خون دل خویش
تجلی را چناں عریاں نہ خواہم — نخواہم جز غم پنہاں نخواہم

مرا راز و نیاز آدمے دہ
مرا سوز و گداز آدمے دہ — (زبور عجم)

لیکن بہت سے انسان ہیں جو ابلیس کا کام کرتے ہیں اور جس طرح لالہ کے اندر دھواں ہوتا ہے۔ ان کے اندر بھی بیرنگی پائی جاتی ہے۔ ان کی تمام ظاہری پاکبازیاں دجل و فریب کا آئینہ دار ہوتی ہیں۔

اے بسا آدم کہ ابلیسی کند — اے بسا شیطاں کہ ادریسی کند
رنگ او بے رنگ و بوو او نمود — اندروں او چوں لالہ داغ دود
پاکباز و کعبتین او دغل — ایں دغد و نفاق اندر بغل

(پیام مشرق)

مگر یہ کہ انسان کی فطرت میں "احسن تقویم" اور "اسفل السافلین" دونوں کی صلاحیت موجود ہے۔ وہ کس طرح اپنی تمام داخلی اور خارجی قوتوں کو مجتمع کر کے صحیح معنوں میں وہ بشر بن سکتا ہے جو اشرف المخلوقات قرار دیا گیا ہے۔ اقبال کی فکر کا منتہا ہے یہ ایک غلط فہمی ہو گی اگر ہم یہ تصور کر لیں کہ اقبال صرف پیغمبر اسلام صلعم کو انسان کامل تصور کرتا ہے۔ دراصل وہ اپنے خمخانہ شراب کے عام کرنے کا خواہشمند ہے۔ اور ہر انسان کو "مرد کامل" یا بشر بنانا چاہتا ہے۔ البتہ وہ رسول عربی کو "خیر البشر" قرار دے کر بطور نمونہ یا اسوۂ حسنہ پیش کرتا ہے۔

آنچہ در آدم بگنجد عالم است — آنچہ در عالم نگنجد آدم است
آشکارا مہر و مہ از جلوہ اش — نیست رہ جبریل را در خلوتش

برتر از گردوں مقام آدم است
اصل تہذیب احترام آدم است

یعنی جو چیز انسان کے اندر نہیں سما سکتی وہ دنیا ہے اور جو عالم کے اندر سما سکے وہ انسان ہے۔ انسان کے جلوے سے مہر و ماہ آشکارا ہوتے ہیں اور اس کے خلوت کدہ میں جبریل کو بھی جگہ نہیں مل سکتی۔ انسان کا مرتبہ آسمان سے بھی بلند ہے اور انسان کا احترام اصل تہذیب ہے۔

اقبال اور نیٹشے

بعض اصحاب نے اقبال کے مرد کامل کو جرمنی کے مشہور فلاسفر نیٹشے کے "فوق البشر" کے نظریے سے مطابقت کی کوشش کی ہے اور یہ خیال قائم کیا کہ اقبال نے یہ نظریہ نیٹشے سے مستعار لیا تھا اور زبان اور شاعری کے سحر سے اس کو اجاگر کر کے پیش کیا ہے۔ نیٹشے کے "فوق الانسان" اور اقبال کے مرد کامل میں اصولی اور بنیادی فرق ہونے کے علاوہ تاریخی حیثیت سے اقبال کی خوشہ چینی کا تصور غلط ہے۔ اقبال نے ڈاکٹر نکلسن کو جو خط لکھا ہے اس میں اس کی صراحت خود کی ہے۔

"وہ انسان کامل کے متعلق میرے تخیل کو صحیح طور پر نہیں سمجھ سکا۔ یہی وجہ ہے کہ اس نے بحث کر کے میرے انسان کامل اور جرمن مفکر کے فوق الانسان کو ایک ہی چیز فرض کر لیا ہے۔ میں نے آج سے قریباً بیس سال قبل انسان کامل کے متصوفانہ عقیدہ پر قلم اٹھایا تھا اور یہ وہ زمانہ ہے کہ نہ تو نیٹشے کے عقاید کا غلغلہ میرے کانوں تک پہنچا تھا نہ اس کی کتابیں میری نظر سے گذری تھیں۔ یہ مضمون انڈین انٹی کیوری میں شائع ہوا جب ۱۹۰۰ء

میں میں نے ایرانی الہیات پر کتاب لکھی تو اس کتاب میں اس کو شامل کر دیا گیا۔

مرد کامل کے خصائص

اقبال کا مردِ کامل تکمیلِ انسانیت کی ابتدا اثباتِ خودی سے کرتا ہے۔ جو نفیِ خودی کا ضد ہے۔ اس کے نزدیک زندگی نفس دراز کی نہیں بلکہ وہ تین شاہدوں سے اپنے وجود پر شہادت طلب کرتا ہے۔

شاہد اول شعور خویشتن   خویش را دیدن بنور خویشتن

اول شاہد خود اس کے اندر کا شعور ہے جس سے وہ اپنی ذات کو خود اپنے نور سے دیکھتا ہے۔

شاہد ثانی شعور دیگرے   خویش را دیدن بنور دیگرے

دوسرا شاہد کسی دوسرے نور اور اس کے نور سے اپنے کو دیکھنا۔

شاہد ثالث شعور ذات حق   خویش را دیدن بنور ذات حق

تیسرا شاہد ذاتِ حق کا شعور اور اپنے آپ کو ذاتِ حق کے نور میں ملاحظہ کرنا اور اگر اس نور کے سامنے وہ استوار رہ جائے تو خدا کی ذات کی طرح وہ بھی حی و قیوم ہو جاتا ہے

پیش ایں نور ار بمانی استوار   حی و قائم چوں خدا خود را شمار

کمالِ انسانیت کے لئے اپنے وجود کا پرزور اقرار ضروری ہے نہ کہ اس کا انکار۔ اس کا بقا لازم نہ کہ اس کو فنا کر دینا۔ خواہ یہ فنا ذاتِ باری تعالیٰ کے آغوش ہی میں ہو۔ انسان کا متن "انا" ہے "انا" ایک زندہ حقیقت ہے اور اس کا احساس وادراک اسے تمام عالم کے مقابلے میں قائم کرتا اور خود تجلی ذاتِ حق کے حضور میں باقی رکھتا یہی شرطِ تکمیلِ شرفِ انسانی کی ہے۔

جو لوگ کہ اس "ایغو" کے وجود پہ شک کرتے ہیں۔ ان سے اقبال سوال کرتا ہے کہ

بگو با من کہ دارائے گماں کیست ؟

وہ کون ہے جو شک کرتا ہے۔ اس امکان کا تو پتہ لگنا چاہئے اور پھر فساد کرتا ہے کہ۔

جہاں پیدا و محتاج دلیلے
نمی آید بہ فکر جبرئیلے

دنیا ظاہر ہے اور پھر بھی کیا اس کو ثابت کرنے کے لئے دلیل کی ضرورت ہے۔ یہ تو جبریل کی فکر میں نہیں آنے والی بات نہیں ہے بس "ایغو" جب اپنی تکمیل شناگی کے لئے منزل کی طرف روانہ ہوتا ہے تو اس کے راستہ میں دو رکاوٹیں پڑتی ہیں۔ اور ان دونوں رکاوٹوں کا رفع کرنا ایغو کے لئے ضروری ہے۔ اول فطرت اور دوئم نفس انسانی۔ ایغو اور فطرت دونوں کے وجود سے انکار کر کے صرف خدا کے وجود کو تسلیم کر لینا اقبال کے نزدیک خود فریبی ہے۔ ایغو جب تک کہ اپنے وجود کا اقرار کر کے تسخیر فطرت اور تسخیر نفس نہ کرے وہ اپنے راستہ سے رکاوٹیں رفع کر کے کمال دوام کے سفر کا سامان نہیں کر سکتا۔ فطرت کی تسخیر علم سے اور نفس کی تسخیر عشق سے حاصل ہوتی ہے۔ اس طرح علم اور عشق دونوں "مرد کامل" کو اپنے مقصد اعلیٰ کے حاصل کرنے میں امداد و اعانت دیتے ہیں لیکن علم بلا عشق گمراہ اور مردود ہے۔ آج یورپ نے علم اور سائنس کے ذریعہ فطرت کی بہت کچھ تسخیر کر لی ہے۔ اور اس میدان میں انکی فتوحات روز افزوں ترقی پر ہیں مگر "عشق" کے نہ ہونے سے وہ تکمیل انسانیت میں سب سے بڑی رکاوٹ بن گیا ہے۔

جلوۂ او بے کلیم و شعلۂ او بے خلیل

عقل ناپروا متاع عشق را غارتگر است

در ہوایش گرمی یک آہ بیتابانہ نیست
رند این میخانہ را یک جرأت رندانہ نیست

یعنی اس کا جلوہ بلا کلیم اور اس کا شعلہ بلا تحلیل ہے۔ اس کی عقل نا پرواستارع عشق کو غارت کر دیتی ہے۔ اس میں ایک بھی آہ بیتابانہ کی گرمی نہیں ہے اور اس میخانہ کے رند میں ایک بھی لغزش مستانہ نہیں ہے۔

مرد کامل اول ہستی وجود الغیر یا روح کا اقرار کرتا ہے اور اسے زندہ پائندہ و دائم رکھنے کا خواستگار رہتا ہے۔ اس آرزو کی خلش اسے مقاصد بنانے پر آمادہ کرتی ہے۔ وہ مقاصد کے اصول کی لگن میں مست ہو جاتا ہے اور ایک اندرونی کیفیت وادراک و جذب و شوق پیدا کرتا ہے جس کا نام خونِ جگرِ عشق ہے چونکہ خودی سوال سے ضعیف ہوتی ہے۔ وہ سوال نہیں کرتا۔ وہ ایسا شیشہ ہے جو ٹوٹ جاتا ہے مگر مو یا بال نہیں آنکتا۔ ع

سبوی خود مالی خواستن نتوان شکستن نتوان

مناصب کی تلاش اور بھیک اس سے پرے ہے۔ وہ حباب کی طرح سمندر کے اندر بھی نگوں پیالہ رہتا ہے۔

چوں حباب از غیرتِ مردانہ باش
ہم بہ بحر اندر نگوں پیمانہ باش

وہ اس مادی دنیا اور کائنات کے وجود سے انکار کر کے راہ فرار اختیار نہیں کرتا بلکہ اس کے وجود کو تسلیم کرتا ہے اور اپنی خودی سے اس کی تسخیر پر آمادہ ہو جاتا ہے اور آخر کار اسے زیر نگیں لاتا ہے۔ وہ خدائے واحد کے وجود پر یقین لازمی تصور کرتا ہے مگر اس لئے نہیں کہ اپنے وجود کے قطرہ کو اس دریا میں گم کر دے بلکہ اس واسطے کہ اسے اپنے سامنے بطور

نمونۂ کمال رکھ تخلقوا باخلاق اللہ (اپنے اندر اللہ کے اخلاق پیدا کرو) ایک عمل پیرا ہو۔ وہ اپنی خودی کے راستے سے خدا تک پہنچتا ہے اور اس کے برقِ تجلی کے سامنے بھی اپنی ہستی کو قائم رکھتا ہے ؎

ز من گو صوفیانِ با صفا را — خدا جویانِ معنی آشنا را
غلامِ ہمتِ آں خود پرستم — کہ با نورِ خودی بیند خدا را

اور خدا سے اگر وہ کچھ مانگتا ہے تو یہ نہیں کہ اس جزو کل کے وجود میں مل کر غائب ہو جائے بلکہ یہ کہ اس کی خودی قائم و برقرار رہے اور اُسے وجود کی ابدیت اور دوام کی لذت حاصل ہو۔ ؎

ہم ز خدا خودی طلب ہم ز خودی خدا طلب

وہ قوت و شوکت بھی طلب کرتا ہے مگر نیٹشے کے "فوق الانسان" کی طرح وہ اس کے لئے ناجائز وسائل استعمال نہیں کرتا اور نہ صرف قوت و شوکت کے حصول کو مقصد تصور کرتا ہے۔ اس کی حاصل کردہ قوت و شوکت اخلاق و آئینِ الٰہیہ کی تابع ہوتی ہے۔ اور اس کے ظل سرائے خاص میں نامحرم شر کا گذر نہیں ہے۔ اس کے مقاصد اور ذرائع دونوں خیر ہی خیر ہوتے ہیں۔ مگر وہ اس طرح قوت و شوکت حاصل ضرور کرتا ہے اور شر کی تمام قوتوں اور شوکتوں کو خس و خاشاکِ باطل کو شعلہ بن کر بھسم کر ڈالتا ہے چنانچہ قوت کے متعلق اس کا اعتقاد یہ ہے کہ :-

لا دیں ہو تو ہے زہرِ ہلاہل سے بھی بڑھ کر
ہو دیں کی حفاظت میں تو ہر زہر کا تریاق

وہ تہذیب و تزکیۂ نفس کے نام پر خانقاہ اور رہبانیت کی زندگی اختیار نہیں کرتا۔ اور نہ ترکِ جہاں کو مسلک بنا کر غوغائے عالم سے محترز

ہوتا ہے۔ بلکہ ان سے الجھتا اور ان کی اصلاح کرتا ہے۔ کنجِ عافیت میں بیٹھ کر اللہ کی یاد اور عالم کون و فساد سے بے خبری انہیں خوردہ سست اعصابی اور خود فریبی ہے جس سے وہ ہمیشہ اجتناب ہی نہیں نفرت رکھتا ہے۔ وہ یہ تصور نہیں کرتا کہ خدا نے ایک مرتبہ اس دنیا کو بنا دیا اور خود اس سے کنارہ کش ہو گیا اور اس کی تعمیر و تکمیل سے اب اس کو کوئی مطلب و واسطہ نہیں۔ بلکہ دنیا کو وہ تغیر پذیر پاتا ہے ہر لمحہ اس میں نئی اور تبدیلی پیدا ہوتے ہوئے دیکھتا ہے اور خود اپنے ضمیر کی قوت سے وہ نئے نئے عالم ایجاد کرتا ہے۔

کہ آ رہی ہے دمادم صدائے کن فیکون

اس طرح وہ ہر لحظہ ایک نئی شان سے جلوہ گر ہوتا ہے ؎

فریب نظر ہے سکون و ثبات — تڑپتا ہے ہر ذرۂ کائنات
ٹھہرتا نہیں کاروانِ وجود — کہ ہر لحظہ ہے تازہ شانِ وجود
سمجھتا ہے تو راز ہے زندگی — فقط ذوقِ پرواز ہے زندگی

اس طرح وہ ہر ذرہ کو خدا کی صفت خود نمائی سے مملو پاتا ہے ؎

ہر چیز ہے محو خود نمائی — ہر ذرہ شہید کبریائی

کیونکہ عالم آب و خاک کا سرعیاں انسان ہے جس کے مطالعہ و مشاہدہ کے بغیر کائنات عدم و وجود برابر ہوگا۔ اور پھر انسان اپنی خودی کے مطالعہ سے خدا کی معرفت حاصل کرتا ہے

عالم آب و خاک و باد سرعیاں ہے تو کہ میں؟
وہ جو نظر سے ہے نہاں اس کا جہاں ہے تو کہ میں؟

ان وجوہ سے وہ تقلیدی فکر مسلک گوسفندی (یعنی نفی خودی)

راہبانہ طرزِ عمل، اور بندگی و بے چارگی سے نجات پاتا ہے۔ وہ کائنات پر تصرف کرتا ہے اور عرفانِ جلال و جمالِ کبریائی سے اپنے اندر فیضانِ جذبۂ شوق پیدا کرتا ہے۔ وہ بیدار رہتا ہے خواب اس پر طاری نہیں ہوتا۔ ذوقِ عمل کی قوت سے کبھی محروم نہ ہونے کی وجہ سے وہ سکر کی کیفیت سے بے نیاز رہتا ہے۔ اس لئے وہ تقدیر پر تکیہ نہیں کرتا بلکہ وہ اپنی تقدیر خود بناتا ہے۔

عبث ہے شکوۂ تقدیرِ یزداں　　تو خود تقدیرِ یزداں کیوں نہیں ہے

جب وہ کوئی ارادہ کر لیتا ہے تو سمجھ لینا چاہئے کہ یہی تقدیرِ الٰہی ہے۔

قدرت کے مقاصد کا عیار اس کے ارادے
دنیا میں بھی میزان قیامت میں بھی میزان

مردِ کامل ایک مردِ حر ہوتا ہے۔ آزاد اپنے اعمال و افعال اور اس کے نتائج و اسباب کی وہ خود ذمہ داری لیتا ہے۔ اس کا الزام وہ کسی اور ذات پر نہیں ڈالتا کہ خود مرتکبِ گناہ ہو اور اس کا محرک خالقِ کائنات کو قرار دے۔ وہ تسلیم و رضا کو بھی تقدیرِ تسلیم نہیں کرتا بلکہ قانون و اخلاقِ الٰہیہ کی اتباعِ کامل و اطاعتِ تامہ کو تسلیم و رضا کا درجہ دیتا ہے۔ وہ مستیٔ گفتار و مستیٔ افکار سے بالا ہو کر مستیٔ کردار کو اپنے رگ و پے میں پیدا کرتا ہے۔ وہ جراتِ رندانہ کا سرمایہ دار ہوتا ہے اور آتشِ نمرود میں خود بخود بلا خیالِ نتائج کود پڑتا ہے۔

خود بخود کود پڑا آتشِ نمرود میں عشق
عقل ہے محوِ تماشائے لبِ بام ابھی

وہ انتہائی خوددار ہوتا ہے کبھی غیرت و خودداری کو ہاتھ سے نہیں

دیتا۔ وہ خطرات سے بھاگتا نہیں بلکہ خطرات کو دعوت دیتا ہے اور اپنے آبدار سونے کو خطرات کے شعلہ میں ڈال کر اس کا امتحان لیتا ہے۔ اس کے نزدیک

خطر تاب و تواں را امتحان است   عیارِ ممکناتِ جسم و جاں است

وہ حکمت عملیوں اور فریب کاریوں کے قریب نہیں جاتا آزادی و بیباکی و حق گوئی اس کی سرشت میں داخل ہو جاتی ہے۔

آئین جواں مرداں حق گوئی و بے باکی
اللہ کے شیروں کو آتی نہیں روباہی

وہ زمان و مکان کا تابع نہیں ہوتا بلکہ ان زنجیروں کو توڑ کر اس سے پرے نکل جاتا ہے۔ اس لئے اس پر موت کبھی طاری نہیں ہوتی۔ وہ ہمیشگی کی زندگی سے دوچار ہوتا ہے۔ جب ظاہری موت نمودار ہوتی ہے تو اس کے لبوں پر مسکراہٹ رہتی ہے۔ کیوں کہ وہ جانتا ہے اب وہ ابدی زندگی کی مسافت اور منزل میں قدم رکھ رہا ہے۔

موت کو سمجھے ہیں غافل اختتام زندگی   ہے یہ شام زندگی صبحِ دوام زندگی

اس طرح وہ حیاتِ ابدی کو حاصل کر لیتا ہے اور موت سے کبھی نہیں مرتا

ہو اگر خود نگر و خود گر و خود گیر خودی
یہ بھی ممکن ہے کہ تو موت سے بھی مر نہ سکے

وہ رسم و رواج کا پابند نہیں ہوتا بلکہ اصول و اخلاق اور زندگی کی قدروں کے ترازو میں سب کو تولتا ہے اور جہاں جہاں وہ پورے نہیں اترتے ان کی زنجیروں کو توڑ کر پھینک دیتا ہے اور نئے نئے تجربوں سے ہمیشہ اپنی خودی کو مستحکم کرتا ہے۔

ہر لحظہ نیا طور نئی برقِ تجلی　　اللہ کرے مرحلۂ شوق نہ ہو طے

اس کی زندگی مسلسل عمل ہوتی ہے۔ اور اسی مسلسل عمل سے وہ اپنے وجود کے مقاصد کے حصول میں کامیاب ہوتا ہے۔

ساحل افتادہ گفت　　گرچہ بسے زیستم
ہیچ نہ معلوم شد　　آہ کہ من کیستم
موج ز خود رفتۂ　　تیز خرامید و گفت
ہستم اگر می روم
گر نروم نیستم

ساحل افتادہ نے کہا کہ اتنے دنوں کی زندگی مجھ کو ملی مگر ہائے افسوس اب تک نہ معلوم ہو سکا کہ میں کون ہوں۔ از خود رفتہ موج تیزی سے گزری اور کہا کہ اگر میں حرکت میں رہوں تو میرا وجود ہے ورنہ میرا کوئی وجود نہیں اور جس کی انتہا بظاہر موت ہے اور مادی دنیا اس کی اول منزل ہے جس کے حصار زمان و مکان ہیں سمجھو جب وہ ان حصاروں کو توڑ کر آگے بڑھتی ہے تو ضمیرِ وجود میں اس کو ہزاروں عالم دکھائی دیتے ہیں۔

یہ عالم یہ ہنگامۂ رنگ و صوت　　یہ عالم کہ ہے زیرِ فرمانِ موت
یہ عالم یہ بت خانۂ چشم و گوش　　جہاں زندگی ہے فقط خورد و نوش
خودی کی یہ ہے منزلِ اولیں　　مسافر یہ تیرا نشیمن نہیں
بڑھے جا یہ کوہِ گراں توڑ کر　　طلسمِ زمان و مکاں توڑ کر
جہاں اور بھی ہیں ابھی بے نمود　　کہ خالی نہیں ہے ضمیرِ وجود
ہر اک منتظر تیری یلغار کا　　تری شوخیِ فکر و کردار کا
یہ ہے مقصدِ گردشِ روزگار　　کہ تیری خودی تجھ پہ ہو آشکار

تو ہے فاتحِ عالمِ خوب و زشت
تجھے کیا بتاؤں تیری سرنوشت

مردِ کامل مال و زر کا تمنائی نہیں، وہ تو قوت و شوکت کے ساتھ املاک و نخوت کا خواہاں نہیں ہوتا بلکہ فقر اختیار کرتا ہے۔ مردِ کامل کا فقر بے زری کا دوسرا نام نہیں ہے۔ بلکہ خودداری و اعلیٰ حوصلگی۔ بلندیٔ عزم اور حقیقت شناسی کا ایک مجموعہ ہے۔ وہ فقر نہیں جو راہبِ خانقاہ اختیار کرتا ہے۔ اور جس سے سکون پرستی کی فضا پیدا ہوتی ہے بلکہ اس کا فقر ہمیشہ طوفانی ہوتا ہے ؎

سکوں پرستیٔ راہب سے فقر ہے بیزار
فقیر کا ہے سفینہ ہمیشہ طوفانی

مردِ کامل فقر کو عالمِ لذات اور عالمِ نفس کے شکار بننے کے لئے اختیار نہیں کرتا بلکہ اس سے اسرارِ جہانگیری کھلتے ہیں۔ اور وہ اکسیر بن جاتی ہے

اک فقر سکھاتا ہے صیاد کو نخچیری
اک فقر سے کھلتے ہیں اسرارِ جہانگیری
اک فقر سے قوموں میں مسکینی و دلگیری
اک فقر سے مٹی میں خاصیتِ اکسیری

مردِ کامل کا نانِ جویں بازوئے حیدری ضروری رفیق ہے۔ یہ زندہ خودی کا شکوہ سنجر و طغرل یعنی سر قوتِ نفس کے ساتھ استغنائے کامل اور جستجوئے عظمت و سطوت ہے ؎

خودی ہو زندہ تو ہے فقر بھی شہنشاہی
نہیں ہے سنجر و طغرل سے کم شکوہِ فقیر
خودی ہو زندہ تو دریائے بیکراں پایاب
خودی ہو زندہ تو کہسار پرنیان و حریر
نہنگ زندہ ہے اپنے محیط کے آزاد
نہنگ مردہ کو موجِ سراب بھی زنجیر

مردِ کامل کا فقر اسکندری سے بہتر ہے۔ کیونکہ یہ انسان کو اس کے شرفِ کامل پر تعمیر کرتا ہے

مرا فقر بہتر ہے اسکندری سے
یہ آدم گری ہے وہ آئینہ سازی

مردِ کامل حصولِ رزق کو جائز اور محنت کوش راستوں سے ناجائز نہیں تصور کرتا اور نہ وہ عام مدعیانِ قناعت و توکل کے مانند بے ضبطی محبت ایثار رزق منتِ غیر سے لینا چاہتا ہے۔ مردِ کامل تو باپ کے پس ماندہ لعل کو بھی پاکر شرمندہ ہوتا ہے۔ وہ پتھر سے خود لعل نکال کر اس میں عیش و مسرت کا لطف حاصل کرتا ہے۔

پشیماں شو اگر لعلے ز میراثِ پدر خواہی
کجا عیش بروں آوردنِ لعلے کہ در سنگ است

مگر وہ بے زری کو حصولِ مقاصد کے لئے اختیار کرتا ہے۔ اس کا فقر اختیاری ہوتا ہے، نہ کہ جبری۔ اس کے فقر میں قلندری اور کلہ داری کا امتزاج ہوتا ہے۔ اس سے وہ دونوں عالم کو تسخیر کر لیتا ہے۔

شنیدم شبے از مردِ پیرے
کہن فرزانۂ روشن ضمیرے
اگر خود را نبادا ری نگہ داشت
دو گیتی را بگیرد آں فقیرے

مردِ کامل کی زندگی مسلسل عمل و جہاد ہے۔ وہ کسی عالم سے اعتنا نہیں کرتا۔ بلکہ اپنی دنیا آپ بناتا ہے ؎

اپنی دنیا آپ پیدا کر اگر زندوں میں ہے
سرِ وحدت ہے ظہورِ کن فکاں ہے زندگی

اس لئے کسی قسم کی غلامی کی گرد اس کے سراپا نور وجود کو میلا نہیں کر سکتی۔ وہ کسی دوسرے سے اکتساب نہیں کرتا بلکہ خود اپنے باطن

کے نور سے فروزاں ہوتا ہے۔ اور اس کے لمعات سے تمام کائنات کو منور کر دیتا ہے۔ وہ پروانہ کی طرح طواف شمع نہیں کرتا بلکہ اپنی فطرت کی تجلی گاہ میں آباد ہوتا ہے جو تاریکی اوہام کو دور کر کے یقین کامل کے اجالے کو نمودار کرتی ہے۔

شب خود روشن از نور یقین کن
ید بیضا برون آید از آستین کن

وہ افلاطون اور فارابی کی آنکھوں سے دنیا کو دیکھتا بلکہ خود اپنی آنکھوں سے دیکھتا ہے۔ وہ کسی سے آنکھ کی بھیک نہیں مانگتا۔

میان آب و گل خلوت گزیدم ز افلاطون و فارابی بریدم
نکردم از کسے دریوزۂ چشم جہاں را جز بچشم خود ندیدم

اگر دنیا اس کے ساتھ سازگار نہیں ہوتی تو وہ خود دنیا سے ساز نہیں کرتا۔ بلکہ اسے الٹ دیتا ہے اور اس زمین و آسمان مستعار کو پھونک کر اس کی خاکستر سے خود اپنی دنیا تعمیر کرتا ہے۔

گفتند جہان ما آیا بتو می سازد گفتم کہ نمی سازد گفتند کہ برہم زن
پھونک ڈالے یہ زمین و آسمان مستعار اور خاکستر سے آپ اپنا جہاں پیدا کرے
محبت مجھے ان جوانوں سے ہے ستاروں پہ جو ڈالتے ہیں کمند

وہ ساتھی نہیں ڈھونڈتا اور کثرت خلائق کی بھیڑ ہی کا انتظار نہیں کرتا بلکہ تنہا انقلاب پیدا کرتا ہے۔ اس کا عمل مددگاروں کی امید پر منحصر نہیں ہوتا

سوئے گردوں نالۂ شب گیر کا بھیجے سفیر رات کے تاروں میں اپنے رازداں پیدا کرے

وہ اپنے افکار و عقاید پر پورا یقین رکھتا ہے۔ اور قوت اس کی ضمیر میں پوشیدہ ہوتی ہے۔ گمان آباد ہستی میں اس کا یقین ایسا ہوتا ہے جیسے کہ بیابان کی شب تاریک میں قندیل رہبانی جگمگا رہا ہو۔

گمان آباد ہستی میں یقیں مردِ مسلماں کا — بیاباں کی شبِ تاریک میں قندیلِ رہبانی

اور عالم گیر محبت اس کا احاطہ کئے ہوتی ہے اور اس طرح وہ مسلسل عمل سے اپنے آپ کو مکمل کر کے اپنے آپ کو نبردِ زندگانی کے لئے آمادہ کرتا ہے ؎

یقیں محکم عمل پیہم محبت فاتحِ عالم
جہادِ زندگانی میں ہیں یہ مردوں کی شمشیریں

ان صفاتِ معنوی سے آراستہ و پیراستہ ہو کر "مردِ کامل" خلیفۃ اللہ یا نائبِ الٰہی کی حیثیت سے نمودار ہوتا ہے، اور جب وہ آشکارہ ہوتا ہے تو کائنات میں ایک لرزہ پڑ جاتا ہے۔

زادنِ طفل از شکستِ اشکم است — زادنِ مرد از شکستِ عالم است
ہر دو زادن را دلیلِ آمد اذاں — آں بلب گویند ایں از عینِ جاں

جانِ بیدارے چو زاید در بدن
لرزہ افتد دریں دیرِ کہن

یعنی پیٹ کے شکست ہونے سے بچے کی پیدائش اور عالم کے شکست ہونے سے مرد پیدا ہوتا ہے۔ دونوں کی پیدائش کے وقت اذان لازم ہے اول الذکر کے لئے اذان لبوں سے کہی جاتی ہے اور مقدم الذکر کے لئے عینِ جاں سے کہی جاتی ہے۔ جب بدن میں جان بیدار پیدا ہوتی ہے تو اس دیرِ کہن میں لرزہ پیدا ہو جاتا ہے۔

اس کے جمال و جلال کا ایک ایسا دل کش منظر ہوتا ہے کہ صرف اس کا وجود عالم میں حسن و خوبی کے لئے دکھائی دیتا ہے۔ اور اس کا خاکی نہاد ہونا اس کے پرواز میں مانع نہیں ہوتا وہ شش جہت کو توڑ کر نکل سکتا ہے اور معراجِ روحانی و جسمانی حاصل کرتا ہے ؎

چیست جاں جذبِ سرود و سوز و درد ذوقِ تسخیرِ سپہرِ گرد گرد
از شعور است ایں کہ گوئی نزد و دور چیست معراج انقلاب اندر شعور
انقلاب اندر شعور از جذبِ شوق وارہاند جذبِ شوق از تحت و فوق

ایں بدن با جان ما انباز نیست
مشتِ خاکے مانعِ پرواز نیست

اس عروجِ کمال تک پہنچنے کے بعد وہ فرشتہ صید و یزداں کا شکار بن جاتا ہے اور ایک ایسی دنیا تعمیر کرتا ہے جو زیادہ رہنے کے قابل اور زیادہ آراستہ ہے۔

نوائے عشق را ساز است آدم کشاید راز و خود راز است آدم
جہاں او آفرید ایں خوب تر ساخت مگر با ایزد انباز است آدم

اجتماعی زندگی

اقبال کا مردِ کامل، فردِ کامل یا انسانِ مجسم ہونے کے بعد اپنے کو جماعت سے وابستہ کرتا ہے، اور جس طرح اس نے انفرادی خودی کو قائم کیا تھا وہ جماعتی خودی کو آشکارا کرتا ہے۔

روحِ ملت را وجود از انجمن روحِ ملت نیست محتاجِ بدن
تا وجودش را نمود از صحبت است مردہ چوں شیرازۂ صحبت شکست
مردۂ از یک نگاہی زندہ شو بگذر از بے مرکزی پایندہ شو

وحدتِ افکار و کردار آفریں
تا شوی اندر جہاں صاحب نگیں

جماعت فرد کے لیے رحمت ہے اور بلا جماعت فرد کی خودی مکمل نہیں

ہو سکتی ہے۔

فرد از ربط جماعت رحمت است

فرد اور جماعت میں کوئی تضاد نہیں ہوتا بلکہ دونوں ایک دوسرے کے آئینہ دار ہوتے ہیں۔

فرد و قوم آئینۂ یک دیگر اند — سلک و گوہر کہکشاں و اختر اند

فرد جماعت کے اندر اپنے آپ کو گم کر کے اپنی خودی کو زیادہ آبدار بناتا ہے۔

فرد تا اندر جماعت گم شود — قطرۂ وسعت طلب قلزم شود

جس طرح انفرادی خودی مقصد اور آرزو سے قائم اور عشق و محبت سے مستحکم و استوار ہوتی ہے۔ اسی طرح جماعتی خودی بھی مقصد اور آرزو رکھتی ہے۔ بلکہ انفرادی خودی جب تک جماعتی خودی میں گم ہو جائے تخلیق مقاصد کر نہیں سکتی۔

فرد تنہا از مقاصد غافل است — قوتش آشفتگی را مائل است

قوم با ضبط آشنا گرداندش — نرم رو مثل صبا گرداندش

پا بہ گل مانند شمشادش کند — دست و پا بند و کر آزادش کند

جماعت کے اندر فرد کی پابندی عین اس کی آزادی ہے۔ کیونکہ فرد کی طرح جماعت کی خودی کی تربیت بھی آئین و اخلاق کا تابع ہوتی ہے۔

چوں اسیر حلقۂ آئیں شود

آہوئے رم خوئے او مشکیں شود

فرد میں خودی خود نگر ہوتی ہے اور جماعت میں جا کر خود شکن ہو جاتی ہے ابھی تک وہ ایک پھول کی پتی تھی۔ اب ایک مکمل آراستہ چمن بن جاتی ہے۔

در جماعت خود شکن گردد خودی — تا ز گلبرگے چمن گردد خودی

جس طرح جمادات و نباتات کوئی ہنگامہ بپا نہیں کر سکتے اور اپنی افتادگی اور بیکسی پر قانع ہیں۔ اس طرح جماعتی آویزش کے بغیر اپنی انتہائی ریاضت و عبادت کے باوجود انسان حقیر و کم مایہ ہو جاتا ہے۔ مرد کامل جماعت کے ساتھ پیکار کرتا ہے اور باطل کو مٹا کر نقش آئین صالح قائم کرتا ہے۔

یا وسعت افلاک میں تکبیر مسلسل — یا خاک کے آغوش میں تسبیح و مناجات

وہ مذہب مردان خود آگاہ و خدا مست

یہ مذہب ملا و جمادات و نباتات

انسان کی فطرت علیحدگی کے خلاف بنائی گئی ہے۔ اور وہ اپنی اصلیت پر قائم صرف اس حالت میں رہ سکتا ہے جب وہ جماعت کے ساتھ وابستہ ہو۔

فطرتش وارفتۂ یکتائی است — حفظ او از انجمن آرائی است

اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ انسان ایک دوسرے سے لازم ہوتے ہیں۔ اور موتی کے دانوں کی طرح ایک رشتہ میں پرو دئے جاتے ہیں۔ جس سے زندگی کی مشکلات اور مہمات میں ایک دوسرے کے شریک بنتے ہیں اور رفیقان راہ کی طرح ایک دوسرے سے وابستہ ہو جاتے ہیں جس طرح ستارے جذب باہم سے اپنی محفل سجائے ہوتے ہیں اور ایک ستارہ کی ہستی دوسرے سے قائم ہوتی ہے۔

مردماں چوں بیک دگر شوند — سفتہ در یک رشتہ چوں گوہر شوند
در نبرد زندگی یار ہم اند — مثل ہمکاران گرفتار ہم اند
محفل انجم ز جذب باہم است — ہستی کوکب ز کوکب محکم است

"مردِ کامل" جو جماعت قائم کرتا ہے وہ قوت و شوکت حاصل کرتی ہے۔ اور لازمی طور پر پیراۓ محبوبیت ہوتی ہے "مردِ کامل" کی جماعت ہرگز کسی کی غلام نہیں ہوتی مگر وہ کسی کو غلام بھی نہیں بناتی۔ وہ خود آزاد ہوتی ہے۔ اور دوسروں کو بھی آزاد رکھتی ہے۔ جوع الارض مگر وہ پیدا کر چھوٹی قوموں اور جماعتوں کا لوٹ کھسوٹ اس سے پرے ہوتا ہے۔

کیونکہ وہ آئین و اصول کی پابند ہوتی ہے۔ اور اس کی تعمیر پختہ عقائد پہ ہی ممکن ہے جس سے باز اور گویا ایک سا تعقدہ میں نزدیک ہوتے ہیں۔

بندۂ حق بے نیاز از ہر مقام
نے غلام او را نہ او کس را غلام

بندۂ حق مردِ آزاد است و بس
ملک و آئینش خدا داد است و بس

تا ہر آمر کہ باشد پختہ کار
از قوانین گرد خود بندد حصار

جرہ شاہین تیز چنگ و زود گیر
صعوہ را در کار ہا گیرد مشیر

حکمتِ مشرق و مغرب نے سکھایا ہے مجھے
ایک نکتہ کہ غلاموں کے لئے ہے اکسیر

دین ہو فلسفہ ہو فقر ہو سلطانی ہو
ہوتے ہیں پختہ عقائد کی بنا پر تعمیر

مردِ کامل کے جماعت کی بنیاد رنگ و نسل یا جغرافیائی حدود ملک و وطن پر نہیں ہوتی وہ اپنے خیالات کی پرواز میں عرش سے بھی بلند ہوتا ہے۔ اور کسی ملک یا نسب کو اپنا نصب العین حیات نہیں بناتا۔ انسانیت کے شرف ہی کو ضمیر تعمیر انسانی قرار دیتا ہے۔ اور اوّل انسان بننے کے بعد پھر کسی ملک یا وطن سے اپنے کو نسبت دیتا ہے۔ اس کا سرچشمۂ عرفان عقائد اور افکار عالیہ ہوتے ہیں۔ نہ کہ انسانوں کی تقسیم یا قبائلی تعصب یا غرور امتیاز رنگ و خون کی خود نمائی ؎

درویش خدا مست نہ شرقی ہے نہ غربی
گھر اس کا نہ دلی نہ صفاہاں نہ سمرقند

من اول آدم بے رنگ و بویم — ازاں پس ہندی و تورانیم من

وہ عالم گیریت کو اپنا اصول قرار دیتا ہے اور عام انسانی برادری کا اپنے کو ایک فرد تصور کرتا ہے۔ اس کا سب سے بڑا مقصد یہ ہوتا ہے کہ تمام انسانوں کو ایک رشتہ میں منسلک کر دے اور اس لئے وہ عالم کا شہری ہوتا ہے اور بین الاقوامیت سے قومیت کی ابتدا کرتا ہے۔ چنانچہ اس کا پُر غرور نعرہ یہ ہوتا ہے کہ

نہ میں عجمی نہ ہندی نہ عراقی و حجازی
کہ خودی سے میں نے سیکھی دو جہاں سے بے نیازی

آرٹ ہنر اور فنونِ لطیفہ جن کی جماعت حق پرورش کرتی ہے۔ وہ ضمیر بندۂ خاک کو تابناک کرنے والے اور خودی کی حفاظت کے ضامن ہوتے ہیں۔

سرود و شعر و سیاست کتاب و دین و ہنر — گہر ہیں ان کی گرہ میں تمام یک دانہ
ضمیر بندۂ خاکی سے ہے نمود ان کی — بلند تر ہے ستاروں سے ان کا کاشانہ
اگر خودی کی حفاظت کریں تو عین حیات — نہ کر سکیں تو سراپا فسون و افسانہ

گر ہنر میں نہیں تعمیر خودی کا جوہر — وائے صورت گری و شاعری و نائے و سرود

شاعر کی نوا ہو کہ مغنی کا نفس ہو — جس سے چمن افسردہ ہو وہ باد سحر کیا
بے معجزہ دنیا میں ابھرتی نہیں قومیں — جو ضرب کلیمی نہیں رکھتا وہ ہنر کیا

جماعت حق کا نظام حکومت جمہوری ہوتا ہے اور اس کی بنیاد آزادی کامل پر ہوتی ہے۔ جماعت حق کسی کی اور کسی طرح کی مادی یا ذہنی غلامی قبول نہیں کرتی وہ صرف خدا کی سرداری کو مانتی اور اسی کے آگے گردن

جھکاتی ہے۔

سروری زیبا فقط اس ذات بے ہمتا کو ہے
حکمراں ہے ایک وہی باقی بتان آذری

موت کا پیغام ہر نوع غلامی کے لیے
نے کوئی فغفور و خاقاں نے فقیر رہ نشیں

مگر اس کا جمہوری نظام صحیح معنوں میں جمہوری ہوتا ہے جس میں قصہ خواب آور اسکندر و جم کی گنجائش نہیں ہے اور جو بیداری عوام پر مبنی ہوتا ہے۔

نغمہ بیداری جمہور ہے ساماں عیش
قصہ خواب آور اسکندر و جم کب تک

جماعت حق اپنے اندر دولت کی تقسیم مساویانہ رکھتی ہے اس کے اندر سرمایہ داری پناہ نہیں پاتی۔ اور مزدور اور کسان باعزت اور نامور ہوتے ہیں۔ وہ سرمایہ دارانہ نظام بنا کر تدبر کی فسوں کاری سے اس کو محکم کرنے کی سعی لاحاصل نہیں کرتی۔

تدبر کی فسوں کاری سے محکم ہو نہیں سکتا
جہاں میں جس تمدن کی بنا سرمایہ داری ہے

مزدور کا دست دولت آفریں اس نظام میں اپنے حقیقی اعزاز کا طالب ہوتا ہے۔ اس کو خیرات کی طرح نہیں ملتی جیسا کہ مرد دست دراز ہے۔

دست دولت آفریں کو مزدیوں ملتی رہی
اہل ثروت جیسے دیتے ہیں غریبوں کو زکوٰۃ

اور اس کا شکار زمیندار کے چنگل میں اس طرح گرفتار نہیں ہوتا کہ زمیندار تو روز بروز موٹا ہوتا جاتا ہے اور کاشتکار ضعیف و کمزور ہوتا

سبب ہے

دہقان ہے کسی قبر کا اُگلا ہوا مردہ
بوسیدہ کفن جس کا ابھی زیرِ زمیں ہے

اس کا اصول "الارض اللہ" اور اس کا خطاب زمیندار طبقہ سے یہ

ہے

اس سے بڑھ کر اور کیا فکر و عمل کا انقلاب
پادشاہوں کی نہیں اللہ کی ہے یہ زمیں

دہ خدایا یہ زمیں تیری نہیں میری نہیں
تیرے آبا کی نہیں تیری نہیں میری نہیں

زمین کی ملکیت زمین کا بیچنا دہ رہن اسلام کے اصول مالیہ میں ناجائز مطلق ہوتا ہے۔ کیونکہ زمین کسی کی ملک نہیں ہوتی۔

جماعت حق کے معاشی نظام کو بلحاظ ضرورت اولیت ہوتی ہے۔ اس میں بقاء نفس تہذیب نفس پر تقدم رکھتا ہے مگر بلحاظ اہمیت تہذیب نفس کو بہت زیادہ تفوق حاصل ہے دہ مساوات شکم، پر اپنا اساس نہیں رکھتا اور نہ کل زندگی کو مادی تصور کرتا ہے۔ جماعت حق کا تمدن تعمیر مردان آزاد کا نصب العین رکھتا ہے۔ اور اس کا خمیر حقائق سے بنتا ہے۔ جماعت حق عدل۔ مساوات انسانی صداقت اور شجاعت پر قائم ہوتی ہے اور یہی اس کو نیابت الٰہی کا سزاوار قرار دیتے ہیں۔

سبق پھر پڑھ صداقت کا عدالت کا شجاعت کا
لیا جائے گا تجھ سے کام دنیا کی امامت کا

ان اصولوں کی وجہ سے اقوام جہاں میں رقابت بند ہو جاتی ہے کیونکہ

کا گھر غارت گری سے محفوظ رہتا ہے۔ جنگ کا خاتمہ ہو جاتا ہے کرۂ ارضی پر امن و صلح کی حکومت ہوتی ہے۔ تنازعات باہمی شل سرمایہ دار و مزدور، زمیندار و کسان پیدا ہی نہیں ہوتے۔ دولت کے نئے طلال ذرائع ضروری قرار دیے جاتے ہیں اور منعم دولت کے امین بنتے ہیں۔

کرتا ہے دولت کو ہر آلودگی سے پاک و صاف
منعموں کو مال و دولت کا بناتا ہے امین

جماعتِ حق میں عورت کا درجہ

جماعت حق میں مرد اور عورت ایک دوسرے کے رفیق ہوتے ہیں اور خلافت آدم کی تعمیر و بقا میں دونوں کا مساویانہ حصہ ہوتا ہے۔ عورت زندگی کے سوز و ساز کی زمین اور اسرار حیات کی ضامن ہے۔ وہ ہماری تپش اندرونی کو بیدار کرتی ہے اور خاک کو آدم بناتی ہے۔ زندگی کی تمام ممکنات اس کے خمیر میں پوشیدہ ہیں اور اس کے تب و تاب سے زندگی کا استحکام ہے۔ وہ ایک ایسا شعلہ ہے جس سے چنگاریاں نکلتی ہیں اور جان کے سوز کے نذر جان بن سکتی ہے اور وہ تن۔ ہم سب لوگوں کی بلندیاں اسی کی ارجمندیوں سے ہیں اور ہم سب اسی کے باندھے ہوئے نقش ہیں۔ اگر خدا نے تجھے نظر بخشی ہے۔ تو پاکہ بن اور عورت کی پاکیزگی اور بزرگی پر نظر کر سے

مرد و زن وابستۂ یک دیگر اند | کائنات شوق را صورت گر اند
زن نگہ دارندۂ نارِ حیات | فطرت او لوحِ اسرار حیات

آتش ما را بجان خود زند | جوہر او خاک را آدم کند
در ضمیرش ممکنات زندگی | از تب و تابش ثبات زندگی
شعلۂ کز وے شررہا اندگست | جان و تن بے سوز او صورت نبست
ما از ارجمندیہاے او | ما ہمہ از نقش بندیہاے او

حق ترا داداست اگر تاب نظر
پاک شو قدسیت او را نگر

اس لئے جماعت حق کے نظام میں عورت کو اس کا ممتاز و مخصوص درجہ دیا جاتا ہے۔ اور اس سے لاپرواہی نہیں برتی جاتی ہے۔ الغرض جماعت حق ایک زندہ قوم ہوگی جو صبح و شام اپنی تقدیر بدلتی رہے گی اور اس میں قلندرانہ ادائیں اور سکندرانہ جلال کے جلوے نظر آئیں گے۔

نشاں یہی ہے زمانے میں زندہ قوموں کا | کہ صبح و شام بدلتی ہیں ان کی تقدیریں
کمال صدق و مروت ہے زندگی ان کی | معاف کرتی ہے فطرت بھی ان کی تقصیریں
قلندرانہ ادائیں سکندرانہ جلال | یہ امتیں ہیں جہاں میں برہنہ شمشیریں
خودی سے مرد خود آگاہ کا جلال و جمال | کہ یہ کتاب ہے باقی تمام تفسیریں
شکوہ عید کا منکر نہیں ہوں میں لیکن | قبول حق ہیں فقط مرد حر کی تکبیریں

حکیم میری نواؤں کا راز کیا جانے
ورائے عقل ہیں اہل جنوں کی تدبیریں

مرد کامل اور مرد مومن

مرد کامل عقیدۂ توحید الٰہی سے محبت سرمدی رکھتا ہے۔

خواست ہے اور اپنی انفرادی اور اجتماعی خودی کو مکمل کرنے کے لئے جن قوانین و اخلاق عالیہ کا پابند ہوتا ہے۔ تاکہ شر کا گذر نہ ہو اور اس آب دار موتی پہ آلودگی معصیت کی کوئی لکیر نہ ہو۔ مرد کامل چونکہ عقل سے تسخیر فطرت کرنے کے بعد نفس کی آلودگی میں مبتلا ہو کر اپنی کاملیت و اکملیت کو نہ صرف یہ کہ عروج پر نہیں پہنچا سکتا ہے بلکہ ممکن ہے کہ وہ جنس گراں مایہ کو بالکل کھو کر ابلیسیت سے ہمکنار ہو جائے۔ اس لئے اس کو تسخیر فطرت کے ساتھ ساتھ تسخیر نفس کی بھی فکر دامنگیر ہوتی ہے اور اس معاملے میں جیسا کہ پہلے کہا جا چکا عقل اسکی رہنمائی سے مجبور ہے۔ اس لئے وہ عشق کو اپنا ہم سفر راز داں و رہبر بناتا ہے اس لئے نوامیس فطرت کی تلاش کرتا ہے اور وہ خالق فطرت کے سوا دوسرا نہیں دے سکتا۔ پس وہ خالق فطرت کے دئے ہوئے قوانین کے حصار میں اپنے کو محفوظ کر لیتا ہے اور اپنی پختگی اور بے راہ روی سے بچنے کے لئے نیابت الہی کو معیار حق اسوہ حسنہ ٹھہراتا ہے۔ اور اس طرح وہ اس کی اتباع میں لگ جاتا ہے کہ جس نے "روزگار تازہ آئین" پیدا کیا۔ جو رحمۃ للعالمین تھا۔ اور جس نے خالق کائنات کے دیئے ہوئے قوانین کو اس طرح مکمل و مدون کر کے دیدیا ہے کہ تیرہ سو برس گذرنے کے بعد بھی اس میں کوئی تحریف نہیں ہوئی اور نہ اس کے ایک نقطہ میں کوئی فرق آیا۔ حاصل کلام یہ ہے کہ مرد کامل مرد مومن ہی ہو سکتا ہے جو عقیدۂ حق کے ساتھ اتباع و عشق رسالت پر ایمان و عمل رکھتا ہے۔ اس طرح مرد کامل وہی ہے جو عشق رسول میں گم اور اتباع سنت میں کامل ہے۔ اس میں امکان کج روی مفقود ہے جبکہ دوسری جگہ موجود ہے۔ پس اقبال کا پیام "عشق رسول" اور اس کا بیان مرد کامل دونوں ایک ہی معنی کو ظاہر کرنے کے لئے مختلف الفاظ ہیں۔

چند اہم کتابیں

عظمیٰ

بیگم رقیہ تسنیم

اس ناول میں وہ تمام خوبیاں موجود ہیں جو ایک اچھے اخلاقی اصلاحی اور رومانی ناول کے لئے ضروری ہیں۔ ایک انتہائی دلچسپ اور سبق آموز ناول۔

قیمت ۶/۷۵

شکاریات

ریحان احمد عباسی

سیر و شکار سے متعلق آٹھ انتہائی دل چسپ اور سنسنی خیز کہانیوں کا مجموعہ سب کی سب کہانیاں اتنی دل چسپ اور ان کے بیان کرنے کا انداز اتنا پیارا ہے کہ ایک بار شروع کرنے کے بعد بغیر ختم کئے کتاب کو ہاتھ سے رکھنے کو جی نہیں چاہتا۔

قیمت ۳/۵۰

اُردو ادب میں سکھوں کا حصہ

مرتبہ امام مرتضیٰ نقوی

اردو کے آغاز سے عصر حاضر تک کے سکھ شعرا اور ادبا کے مختصر سوانح، انکے فنکاروں پر سیر حاصل تبصرے اور نمونے۔ اردو ادب میں ایک گرانقدر اضافہ، شانداد گٹ اپ بہترین کتابت و طباعت

قیمت ۱۵/۰

رعنائیاں

شکیل بدایونی

شکیل بدایونی کی شاعری میں آہنگ، تنوع اور رنگا رنگی ہے۔ انکی شاعری رواں دواں بھی ہے اور دلچسپ انداز بیان کی حامل بھی۔ اسلئے انکے کلام کے پڑھنے والوں کو وہ لطیف احساس میسر آتا ہے جس کا سرور وہ تا دیر محسوس کرتے رہتے ہیں۔ رعنائیاں پہلا مجموعہ کلام

قیمت ۴/۵۰

صنم و حرم دوسرا مجموعہ کلام۔ قیمت ۳/۵۰ شبستاں تیسرا مجموعہ کلام قیمت ۳/۵۰

ملنے کا پتہ بک سروس، ۵۱۰ مٹیا محل، دہلی ۶

چند اہم کتابیں

غالب کے ڈرامے

شوکت تھانوی

غالب کے اشعار پر لکھے گئے ڈرامے۔ طنز و مزاح سے بھرپور۔ پلاٹ غالب کا اور اس پر تانا بانا بننے والے شوکت تھانوی۔ انتہائی دلچسپ ڈرامے جو بہ آسانی اسٹیج بھی کیے جا سکتے ہیں۔ قیمت ۴/۵۰

گلستانِ ہزار رنگ

سید بہار الدین احمد۔ مقدمہ مولانا آزاد

اس مشہور کتاب میں اردو کے تقریباً سبھی نامور شعراء کے تقریباً پانچ ہزار اشعار ۲۵۶ عنوانات کے تحت ترتیب دیے گئے ہیں۔ تاکہ جس طرح کے شعر کی بھی تلاش ہو، وہ آسانی سے مل جائے۔ کتاب کے آخر میں شعراء کا تعارف بھی دیا گیا ہے۔ اپنے انداز کی منفرد کتاب ہے۔ قیمت ۲۰/-

پتوار

(ناول) ضیا عظیم آبادی

ضیا عظیم آبادی کا انتہائی دلچسپ ناول جسے مصنف نے "متاثراتی ناول" کا نام دیا ہے۔ قیمت ۴/۵۰

ماہ رخ

(ناول) زبیدہ سلطانہ

دل آویز اور پاکیزہ رومان کی ایک ولولہ انگیز داستان۔

قیمت ۸/۵۰

ملنے کا پتہ بک سروس ۵۱۰ مٹیا محل، دہلی ۶۔